ہماری قومی ثقافت

فیض احمد فیض

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی

اشتراک ۔ محبانِ فیض

ہماری قومی ثقافت

فیض احمد فیض

جملہ حقوق محفوظ

مصنف	فیض احمد فیض
مرتب	مرزا ظفر الحسن
ناشر	ادارۂ یادگارِ غالب
طابع	پرنٹنگ محل ناظم آباد کراچی
اشاعت	فروری ۱۹۷۶ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	آٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب لائبریری، دوسری چورنگی ناظم آباد، کراچی ۱۸۔

مرزا ظفر الحسن نے ادارۂ یادگارِ غالب کی جانب سے
پرنٹنگ محل ناظم آباد کراچی
میں طبع کرکے غالب لائبریری ناظم آباد، کراچی ۱۸ سے شائع کیا

قومی یک جہتی

کے

نام

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے

طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

فیضؔ

فہرست مضامین

نمبر	موضوع		صفحہ
۱	پہلی تقریر	تہذیب کیا ہے	۱۳
۲	دوسری تقریر	پاکستانی ثقافت کے اجزائے ترکیبی	۳۱
۳	تیسری تقریر	پاکستانی ثقافت کی ممکن صورتیں	۴۷
۴	پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن	پاکستانی ثقافت اور اس کے مسائل	۶۲
۵	اوراقِ فیض	کلچر ـــــ ایک گفتگو	۸۹
		فکرِ فیض اور ہماری رائے	
		(۶) رئیس امروہوی	۹۴
		(۷) سلیم اختر	۹۸
		(۸) آغا سہیل	۱۰۵
		(۹) ڈاکٹر وزیر آغا	۱۱۱
		(۱۰) جسٹس ایس اے رحمان	۱۱۵
		(۱۱) حسنین کاظمی	۱۲۱
		(۱۲) زہیر صدیقی	۱۴۱

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیضؔ

شانِ نزول

مرزا ظفر الحسن

میں جولائی ۱۹۷۳ء میں اسلام آباد میں فیضؔ کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے ہمیشہ دیکھا ہے، اُن کے مدّاحوں، ضرورت مندوں اور مہمانوں کی وہاں بھی یلغار تھی۔ ہر دن، ہر وقت۔ کبھی تو یہ بھی ہوا ہے کہ جو کپڑے انھوں نے صبح پہنے رات تک پہنے رہے کیوں کہ یاروں نے بدلنے کی مہلت ہی نہ دی۔ فیضؔ ایک ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور جس کی جو ضرورت ہوتی اُسے ممکنہ حد تک پوری کرتے۔ کسی کو تازہ کلام سناتے، کسی کے آٹوگراف البم میں کچھ لکھ دیتے، سفارشی خط لکھ دیتے، ٹیلی فون کر دیتے اپنی ڈائری میں ان کا پتا نوٹ کر لیتے یا اپنا پتا انھیں لکھ کر دے دیتے۔ وغیرہ۔

ایسی ہی ایک نشست میں معلوم ہوا کہ فیضؔ نے ۱۹۶۸ء میں آزاد کشمیر میں متواتر تین تقریریں کی تھیں۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ جہاں ان کی سینکڑوں تقریریں قلم بند یا ٹیپ ہونے سے رہ گئی ہیں آزاد کشمیر کی تقریریں بھی ضائع ہو گئی ہوں گی اور فیضؔ کو کہاں اتنی فرصت یا اگر فرصت ملے تو کہاں یہ خواہش کہ ایسی تقریروں کے اہم نکات نوٹ کر لیں یا مجھے نوٹ کرا دیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے صد سالہ جشنِ تاسیس میں فیضؔ کی تقریر "حاصلِ جشن" رہی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "کیا آپ نے اُسے ٹیپ کیا ہے۔" جواب دیا "ہم نے تو نہیں البتہ ریڈیو والے آئے تھے انہوں نے ٹیپ کیا ہے۔" میں نے کراچی سے لاہور کے اس وقت کے اسٹیشن ڈائرکٹر کو ٹیلی فون کیا تو موصوف نے تحقیق و تفتیش کے بعد بتایا ہاں ہم نے ٹیپ تو کیا تھا مگر پروگرام میں اُس تقریر کے چند

جملے استعمال کرنے کے بعد اسے میٹ دیا۔ کاش ہمارے ریڈیو والے ایسی یادگار اور تاریخی تقریروں کی اہمیت جاننے لگیں۔

ایک دن پاکستان ٹیلی ویژن نے اعلان کیا کہ "موضوعِ سخن" کے عنوان سے فیض احمد فیض" کلچر اور اس کے مسائل" پر گفتگو کریں گے۔ فیض کے مدّاحوں نے اشتیاق کے ساتھ اور چند اصحاب نے جو فیض کے مستقل مخالف ہیں اپنی اپنی تلواریں سونت کر ٹی وی کی یہ گفتگو سنی۔ انھیں تو اس تقریر میں کچھ نہ ملا البتہ سنجیدہ حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔

اسی سلسلے کی دو تقریریں پروفیسر کرار حسین اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے بھی کیں۔ سوائے دو ایک نامعقول بلکہ ناشائستہ باتوں کے جو ڈاکٹر بلوچ کی تقریر کے بعد سوالات کے سلسلے میں کسی نے کہیں دونوں کی تقریروں کو فیض کی تقریر کی طرح پسند کیا گیا۔ عام خیال یہ تھا کہ ان تینوں مقررین نے بڑی جرأت، دیانت، سلیقے اور شائستگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہی وقت کا تقاضا ہے۔

ان تقریروں کے بعد ٹیلی ویژن والوں نے طے کیا کہ فیض احمد فیض، پروفیسر کرار حسین اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو ایک محفل میں جمع ہو کر گفتگو کرنے کی دعوت دی جائے۔ تاریخ اور مقام طے ہو گیا اور پروفیسر کرار حسین اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ لاہور پہنچ گئے۔ بدقسمتی سے اسی دن پروفیسر شاکر علی کا انتقال ہو گیا۔ فیض غمگین و سوگوار تھے کیوں کہ شاکر سے ان کے مراسم دیرینہ اور بڑے پیار و محبت کے تھے اور ٹیلی ویژن پر آنے سے معذرت چاہی مگر ٹی وی والے نہ مانے۔ وجہ ظاہر تھی۔ دو مقررین کوئٹہ اور حیدرآباد سے آ گئے تھے اور ریکارڈنگ کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ انکار بھی واجبی تھا اور ٹی وی کا اصرار بھی۔ آخرِ کار فیض چلے گئے اور پروگرام ریکارڈ اور اس کے بعد نشر ہو گیا۔

.. یہی وہ پروگرام ہے جس کے فیض والے حصّوں پر اخباروں اور رسائل میں کافی بحث کی گئی اور کسی نے پروفیسر کرار حسین یا ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے خیالات پر کوئی خاص منفی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ بعض اہلِ فکر نے یہ تاثر قائم کیا کہ فیض کی مخالفت محض مخالفت کی خاطر کی جا رہی ہے اور جوش پر جوش غالب آ رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ فیض کے اس دوسرے ٹیلی کاسٹ کا مسوّدہ

تمام کوششوں کے باوجود مجھے نہ مل سکا ورنہ میں اُسے بھی شامل کرلیتا۔

میں ادارۂ یادگارِ غالب کے ترجمان سہ ماہی جریدۂ غالب کے ہر شمارے میں "اوراقِ فیض" شائع کرتا ہوں جس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ کسی خاص موضوع پر فیض بولتے جاتے ہیں اور میں اسے لکھتا جاتا ہوں۔ مسوّدہ مکمل ہوجانے کے بعد فیض کو سنا دیتا یا دکھا لیتا ہوں۔ اگر انھیں نظرِ ثانی کی فرصت نہ ملے تو پھر اپنی ذمہ داری پر شائع کر دیتا ہوں۔ جب ٹیلی ویژن کی آخرالذکر نشر کے بعد کچھ لوگوں نے فیض کے تعلق سے جھوٹ سچ لکھنا شروع کیا تو میں نے اُن سے فرمائش کی کہ اسی مضمون کو "اوراقِ فیض" میں سمیٹیں۔ فیض نے دوسرے شمارے کے لئے اوراقِ فیض لکھوا دیے اور میں نے "کلچر ـــــ ایک گفتگو" کے عنوان سے اُسے شائع کر دیا۔ کلچر کے تعلق سے یہ گویا فیض کے تازہ ترین خیالات تھے۔

فکرِ فیض کے جواب میں رئیس امروہوی نے مجھے ایک خط لکھا جس پر مجھے خیال آیا کہ دوسرے صاحبانِ علم و دانش سے بھی پوچھوں کہ ان کی کیا رائے ہے۔ میں نے انھیں بہت سے خطوط لکھے یاد دہانی کی اور بہ طورِ خاص اُن حضرات کو مخاطب کیا جو اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے تھے کہ چائے خانوں اور محدود محفلوں میں اپنی گفتگو سے کوئی گرمی پیدا کر رہے ہیں مگر ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ فیض کے خیالات کی تائید یا تردید میں جو بھی تحریر موصول ہوگی اُسے من و عن غالب میں شامل کروں گا کیوں کہ مسئلہ کلچر کا تھا نہ کہ فیض کا۔ ویسے بھی میں ایک دیانتدار ایڈیٹر کی حیثیت میں کسی ایسی تحریر کی اشاعت سے نہیں ہچکچاؤں گا جس میں ایمان داری کے ساتھ تنقید کے اصولوں کو پیش رکھتے ہوئے اور ادب اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر فیض ہی نہیں بلکہ غالب، اقبال اور دوسرے تمام اکابرینِ ادب اور ان کے فن پر بھی تنقید کی گئی ہو۔ دیانت کا جو درس مجھے جوانی میں ملا ہے اس سے میں نے ساری عمر استفادہ کیا ہے اور اب بطور آموختہ فیض کی محفلوں میں بھی یاد ہوتا رہتا ہے۔

میں شکر گزار ہوں رئیس امروہوی، سلیم احمد، آغا سہیل، ڈاکٹر وزیر آغا، جسٹس ایس۔ اے رحمان، حسین کاظمی اور زہیر صدیقی صاحبان کا جنھوں نے اپنے خیالات قلم بند کر کے بھیجے۔

جس ترتیب سے یہ موصول ہوئے اسی ترتیب سے میں انھیں شائع کر رہا ہوں اور کسی کمی بیشی کے بغیر۔ جس طرح ان مضامین میں فیضؔ کی بعض باتوں سے اختلاف کیا گیا ہے اسی طرح ان حضرات کے خیالات سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی آزادیٔ فکر ہے آزادیٔ تحریر ہے البتہ میں اپنے ناظرین کی توجہ اس امر کی طرف بہ طور خاص مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ان دوستوں نے اس مجموعے کے مشمولہ مضامین میں علم کا وقار کس طرح برقرار رکھا اور قلم کو کس طرح تہذیب کے دائرے میں رکھا ہے۔ نہ اپنی فکر کو مجروح کیا اور نہ فیضؔ کی فکر کو مسخ کیا ہے۔ جہاں فیضؔ سے اتفاق تھا کھل کر ان کی تائید کی جہاں اختلاف تھا ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی۔ علمی اور ادبی بحثوں میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

میں ممنون ہوں غلام حسین اظہر کا جنہوں نے آزاد کشمیر میں کی جانے والی تینوں تقاریر مجھے عطا کیں۔ یہ وہی تقریریں ہیں جن کا حوالہ میں اس دیباچے کے شروع میں دے چکا ہوں۔ یہ تقریریں گورنمنٹ کالج بھمبر کے طلبہ کے رسالے دومیل میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر جب میں نے انھیں پڑھا تو محسوس کیا کہ ان کی ایڈٹنگ ضروری ہے۔ ہر فی البدیہہ تقریر میں جملوں کی تکرار ہوتی ہے اور بعض اوقات جملوں کی ساخت ترمیم طلب ہو جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تقریر میں جو خیال چار پانچ جملوں کے بعد بیان کیا گیا ہو اسے بہ صورت تحریر ان جملوں سے پہلے لے آنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسی کئی اور باتیں تھیں جس کے باعث مجھے ان کی ایڈٹنگ کرنی پڑی۔ البتہ یہ واضح کر دوں کہ میں نے اپنی طرف سے نہ کوئی اضافہ کیا ہے، نہ کمی اور نہ فکرِ فیضؔ کی کوئی تشریح کی ہے۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں پاکستان ٹیلی ویژن کا خصوصاً آغا ناصر کا، جن کی وجہ سے فیضؔ کے نشری خطاب کا مسودہ دستیاب ہوا۔ اس کی بھی مجھے ایڈٹنگ کرنی پڑی کیوں کہ یہ مسودہ بھی فیضؔ کی فی البدیہہ تقریر کی ریکارڈنگ سے تیار کیا گیا تھا اور اس میں بھی وہی کمی تھی جو آزاد کشمیر والے خطبات کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں۔

ہر دو کے آخر میں سوالات بھی پوچھے گئے تھے۔ سوال کرنے والوں کے نام معلوم نہ ہو سکے اس لیے وہ درج کرنے سے رہ گئے۔

ارباب فکر و نظر کے خیالات تحریری صورت میں موصول ہو گئے۔ آزاد کشمیر اور ٹیلی ویژن

کے خطبات مل گئے اور میں نے ان کی ضخامت کا اندازہ لگایا تو محسوس کیا کہ جریدۂ غالب کے محدود صفحات میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر یہ سارا خزینہ اتنا قیمتی ہے کہ اسے کتابی صورت ہی میں محفوظ ہونا چاہیئے اس لیے یہ کتاب مرتب کی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"فیضؔ صاحب سے اب وہ باتیں منسوب نہیں ہونی چاہئیں جن سے وہ خود انکار کرتے ہیں۔ عرصہ ہوا انھوں نے ایک شعر کہا تھا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا کوئی ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ شکایت، وہ آج بھی کر سکتے ہیں۔ تاہم اس معاملے میں کچھ قصور فیضؔ صاحب کا اپنا بھی ہے۔ وہ یوں کہ فیضؔ صاحب اپنے بارے میں کہی گئی باتوں کا ذرا کم ہی نوٹس لیتے ہیں۔ یہ بات اچھی تو ہے لیکن صرف اس صورت میں جب فریق مخالف دلیل کے بجائے دشنام سے کام لے رہا ہو مگر جہاں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے خاموش رہنا نیم رضامندی کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟

اس لیے فیضؔ صاحب یہ کرم کریں کہ وقتاً "فوقتاً" "کلچر۔ ایک گفتگو" ایسا وہائٹ پیپر ضرور شائع کریں تاکہ مطلع صاف ہوتا رہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے احباب اسے فیضؔ کا قصور قرار دیں یا عادت یا ان کی کمزوری اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اسی طرح ایک خاص انداز اور نقطہ نگاہ سے اور ایک مخصوص لہجے میں فیضؔ کی مخالفت کرنے والوں میں بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ایسی مخالفت کسی کا مشغلہ ہے تو کسی کی تجارت۔ وہ لوگ، وہائٹ پیپر" جیسی چیز سے بھی قائل نہیں ہوں گے۔ بقول فیضؔ

" اگر انھیں اس سے کوئی خوشی ہوتی ہے تو خوش ہو لینے دو۔"

تہذیب کی تعریف

پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی

پاکستانی تہذیب کا مستقبل

پہلی تقریر

تہذیب کی تعریف

اِس وقت، جس موضوع پر ہمیں گفتگو کرنا ہے وہ پاکستانی تہذیب یا کلچر کا مسئلہ ہے۔

اِس موضوع کو مَیں نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے، اپنی اور آپ کی سہولت کے لیے تاکہ اِس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے، یا تفصیل سے نہ سہی، ذرا وضاحت سے گفتگو کی جا سکے۔ مَیں اس پہلی نشست میں آپ سے یہ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تہذیب یا کلچر ہے کیا چیز؟ اور اِس کا مفہوم کیا ہے؟ اِس کے معنی کیا ہیں اور اس کی تعریف ہم کیسے کریں؟

اِس موضوع کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ جسے ہم پاکستانی کلچر کہتے ہیں۔ اُس کے اجزا کیا ہیں؟ اُس کے عناصر کیا ہیں؟ اُس کی موجودہ ماہیّت کیا ہے اور اُس کے متعلقہ مسائل کیا ہیں؟

تیسرا حصّہ یہ ہے کہ مستقبل میں اِس پاکستانی تہذیب یا کلچر کے امکانات کیا ہیں؟ اس کی ممکن صُورتیں کیا ہیں؟ اِن صُورتوں سے متعلقہ مسائل کیا ہیں اور اِس سلسلے میں ہم کو کیا کرنا ہے؟

اِس وقت ہم پہلے حصّے پر گفتگو کریں گے۔ یعنی یہ کہ تہذیب یا کلچر ہے کیا چیز؟ جہاں تک میری سمجھ میں آئے گا۔ مَیں بیان کروں گا اور اگر مَیں کسی بات کی وضاحت نہ کر سکوں تو آپ اس کے بارے میں مجھ سے سوالات کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے آپ اِس بات پر غور کریں کہ ہماری زبان میں "کلچر" کا ہم معنی لفظ موجود ہی نہیں۔ یعنی وہ لفظ جس کو ہم بالکل اِس کا مترادف کہہ سکتے ہیں ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ پچھلے بیس پچیس برس سے ہم ایک لفظ رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کو کسی

صاحب نے اپنی لغت سے نکالا کیونکہ ثقافت "ثقافت" کا لفظ آج سے تیس برس پہلے ہم تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ یہ ایجاد ہی پچھلے بیس پچیس برس کی ہے۔ میں "ثقافت" کی بجائے پرانا لفظ "تہذیب" استعمال کروں گا جس سے ہم سب مانوس ہیں۔ تہذیب سے میری مراد وہی مفہوم ہے جو لفظ کلچر کا ہے۔ اردو میں کلچر کے ہم معنی لفظ موجود نہ ہونے پر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیئے اسلیئے کہ آج سے دو سو برس پہلے خود انگریزی میں بھی یہ لفظ موجود نہیں تھا۔

کلچر کا لفظ اُس کے موجودہ مفہوم میں یورپ میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں رائج ہوا۔ یہ صرف کلچر کے لفظ ہی کی بات نہیں ہے اس سے متعلقہ اور بہت سے الفاظ مثلاً آرٹ یا آرٹسٹ یا آرٹسٹک وغیرہ بھی جن معنوں میں ہم آج استعمال کرتے ہیں وہ معنی اٹھارہویں صدی سے پہلے اِن الفاظ میں موجود نہیں تھے یا پھر ایک اور مثال لے لیجیۓ۔ لفظ انڈسٹری۔ صنعت کے معنوں میں۔ یا انڈسٹریل سوسائٹی یا انڈسٹریل ایولیوشن یہ سارے الفاظ بھی پہلی دفعہ صنعت کے معنوں میں ۱۷۷۱ء میں گنتھر نے استعمال کیئے۔ اِسی طرح ایک اور لفظ ہے کلاس۔ مڈل کلاس، اَپر کلاس یا کلاس کانشیس نیس۔ یہ سب الفاظ بھی موجودہ معنوں میں انگریزی میں پہلی بار اٹھارہویں صدی کے آخر میں اور اُنیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوئے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ پہلے کیوں رائج نہیں ہوئے؟ یہ لفظ موجود تو تھے لیکن جن معنوں میں آج استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں مستعمل نہیں تھے۔ آج جن معنوں میں کلاس کہتے ہیں اس مفہوم کا اظہار انگریزی کے دوسرے دو الفاظ کرتے تھے۔ ایک رینک یعنی منصب، دوسرا آرڈر۔ جیسے لوئر آرڈر، ہائر آرڈر۔ کلاس کا لفظ متذکرہ مفہوم میں تو اس وقت استعمال ہوتا جبکہ کلاس موجود ہوتی۔ اُس زمانے کے معاشرے میں ان الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تصورات اُس معاشرے میں موجود نہیں تھے۔ اس لیئے یہ کوئی

تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہماری زبان میں کلچر کا مترادف لفظ موجود نہیں ہے۔

آپ نے اپنے ہاں آرٹ کا ترجمہ فن کیا ہے۔ پرانے زمانے میں انگریزی میں آرٹ کے معنے ہنر یا کوئی کام کرنے کی صلاحیت تھے۔ فن کے بھی یہی معنے تھے لیکن آج ہم فن سے مراد لیتے ہیں مصوّری یا بُت تراشی وغیرہ۔ اِسی طریقے سے آرٹسٹ کا معاملہ ہے۔ یہ لفظ بھی انگریزی زبان میں موجود نہیں تھا۔ آرٹیزن ARTISAN موجود تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں آرٹ کو انھوں نے کرافٹ سے الگ کر کے آرٹسٹ، بنایا اور کرافٹ سے کرافٹس مَین۔ یعنی دستگاہ رکھنے والا۔ آرٹسٹ کا لفظ خالص تخلیقی کام کرنے والے کے لیے رائج ہوا۔ یہ اور اِسی قسم کے لفظ انگریزوں کے ساتھ اور انگریزی کے راستے ہمارے ہاں آئے اور ہم نے بعض کے ترجمے کیے اور بعض اُسی طرح استعمال کیے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں پہلے فرانسیسی انقلاب آیا۔ اُس کے بعد صنعتی انقلاب آیا۔ ان دونوں انقلابات کی وجہ سے وہاں کا پرانا معاشرہ جس کو فیوڈلزم کہہ لیجیے اور جسکا ترجمہ ہم جاگیرداریت کرتے ہیں۔ مکمّل طور پر ختم ہوا اور اُس کی بجائے نیا نظام رائج ہوا جس کی بنیاد صنعت کاری پر رکھی گئی۔ اِس نظام کے رائج ہونے کے ساتھ مغرب میں بہت سے سیاسی اِنقلابات ہُوئے اور معاشرتی انقلابات آئے۔ چنانچہ اُسی زمانے میں جمہوریت کا تصوّر پیدا ہوا اور جمہوری ادارے بنے۔ اُسی زمانے میں زمیندار اور مزارع کا رشتہ ختم ہوا اور اسکی بجائے نئے رشتے پیدا ہُوئے۔

شاید آپ کو معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ اٹھارہویں صدی تک لفظ ڈیماکریسی اور ڈیموکریٹ یورپ میں بُرے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اِس کے معنی شہر گردی یا افراتفری یا غنڈہ گردی کے تھے۔ مسیح سے پانچسو برس پہلے جب یونانیوں نے یہ لفظ ایجاد کیا تو اُس وقت اور اُس کے بہت بعد تک کوئی رشتہ یا تعلق یورپ کی ڈیماکریسی اور فیوڈلزم یعنی جاگیرداری نظام سے نہیں تھا۔ ان کے ذہن سے یہ تصوّر ہی مِٹ چکا تھا کہ لوگ یا جمہوریت

بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ تصور تو اس وقت پیدا ہوا جب فرانسیسی انقلاب آیا، فرانس کی زمینداریاں ختم ہوئیں، جو لوگ کاؤنٹ یا ڈیوک کہلاتے تھے ان کے اختیارات ختم ہوئے اور ان کی بجائے ایک طریقے سے عوام کو حکومت کا مکمل حصّہ سمجھا جانے لگا۔

اِس تمہید سے مطلب صرف یہ ہے کہ وہ الفاظ یا وہ اصلاحات جن کا تعلق معاشرے سے ہوتا ہے۔ ان کا مطلب معاشرے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے چنانچہ آج کلچر کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے۔ وہ آج سے دو سو برس پہلے کسی کے بھی ذہن میں نہ تھا۔

ایک دھندلا سا خاکہ اگر کسی نے پیش کیا تو وہ ابنِ خلدون یا ابنِ مقدم ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مختلف قوموں نے ترقی کس طرح کی ہے اور کیوں کی ہے؟ نقلِ مکانی کے وجوہات کیا تھے کن وجوہ سے ایک قوم دوسری قوم پر غالب آتی ہے۔ کیا کیا اسباب ہوتے ہیں۔ جن سے ایک قوم طاقتور اور دوسری قوم زوال پذیر ہوتی ہے لیکن اس وقت اِبنِ خلدوں یا ابنِ مقدم کے ذہن میں کلچر یا فن کا تصور نہیں تھا۔ ان کے ذہن میں محض قوموں کا تاریخی ارتقاء تھا۔ اس بحث میں جب وہ کہتے ہیں کہ کسی قوم کا بنیادی جذبہ عصبیت کا جذبہ ہوتا ہے یعنی اکٹھے رہنے کا جذبہ اور اتحاد کا جذبہ تو اُس عصبیت کے وہ مختلف اسباب گنواتے ہیں اِس میں ایسی بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ جن کو ہم آج کلچر میں شریک کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ وہ تمام الفاظ اور اصلاحات جو معاشرتی زندگی سے وابستہ ہیں۔ ان کی نوعیت ان کی ماہیّت اور اُن کے معنی معاشرت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ معاشرے کی ہیئت بدلتی ہے تو ان کی صورت بھی بدل جاتی ہے۔ نئے تصوّرات پیدا ہوتے ہیں۔ پرانے تصوّرات کی صُورت بدل جاتی ہے۔ یہی حال کلچر کا ہے۔

کلچر کا جو مفہوم اس وقت ہمارے ذہن میں ہے۔ مَیں آپ کے سامنے پیش کرونگا بہت ممکن ہے سو برس بعد ہمارے معاشرے کی صُورت کچھ اِس قسم کی ہو جائے کہ اِس مفہوم کی بجائے کوئی دوسرا مفہوم پیدا ہو۔ چنانچہ یہ کوئی قطعی اور آخری بات نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں ہماری جو فکر ہے اس کے مطابق ہم کلچر کے کیا معنی متعین کر سکتے ہیں۔ آج بھی ہم کلچر کو تین چار معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اوّل تو شخصی معنوں میں۔ ایک شخصی صفت کے طور پر۔ کسی شخص کی مختلف صفات میں ایک صفت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مہذّب ہے، شائستہ ہے یا تہذیب یافتہ ہے یا کلچرڈ ہے۔ ذاتی اخلاق و عادات کا ایک خاص معیار ہے، جو اُس معیار پر پُورا اُترے اس کو کلچرڈ کہتے ہیں۔

کلچر کا لفظ عام طور پر محض فنون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ خاص قسم کی جمالیاتی تخلیقات جو کہ کوئی معاشرہ پیدا کرتا ہے۔ اِس میں مصوّری ہے، شاعری ہے، فنِ تعمیر ہے۔ مختلف قسم کے جو فنون ہیں ان کو انگریزی میں آرٹس کہتے ہیں۔ اس کو بھی ہم کلچر کہتے ہیں یہ کلچر کی دوسری تعریف یا تشریح ہے۔

عمومی طور پر معاشرہ جس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے رہن سہن میں جو چیزیں داخل ہیں وہ بھی کلچر ہے۔ یعنی معاشرے کا کلچر یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اس قسم کا لباس پہنتے ہیں، اِس قسم کی غذا کھاتے ہیں، اس قسم کے ان کے رسم و رواج ہیں۔ اِن سب چیزوں کو آپ جمع کر دیں تو کلچر کی جامع تعریف سمجھ میں آتی ہے اور وہ جامع تعریف یوں ہے کہ کلچر کی دو صورتیں ہیں، دو شکلیں ہیں۔ ایک اُس کی ظاہری صورت اور دوسری اُس کی باطنی صورت۔ باطنی صورت وہ ہے جسے ہم ذہنی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری صُورت سے آگے بھی دو پہلو یا اس کے دو اجزاء ہیں۔ ایک اس کا شعوری جزو ہے اور دوسرا اس کا غیر شعوری جزو۔

اب دیکھیں کہ یہ باطنی پہلو یا غیر مرئی پہلو کیا چیز ہے؟ یہ عبارت ہے اُن عقائد سے جن پر کوئی معاشرہ ایمان رکھتا ہے یا جن کو معاشرہ مانتا ہے۔ مثلاً اِن عقائد کے ساتھ ہر معاشرے میں بہت سی اُمنگیں اُٹھتی ہیں، آئندہ کے متعلق ان کے بہت سے خواب ہوتے ہیں۔ بہت سے روایتی تصوّرات ہوتے ہیں، قصّے کہانیاں ہوتی ہیں۔

اسے انگریزی میں ویلیوز کہتے ہیں، یعنی قدریں یا اقدار۔ مجموعی طور پر قدروں کا جو نظام باطنی طور پر کسی معاشرے میں رائج ہو وہ اُس کے کلچر کا باطنی پہلو ہے۔ ہر معاشرہ بعض چیزوں کو اچھا اور بعض چیزوں کو بُرا سمجھتا ہے۔ بعض کو اہم سمجھتا ہے اور بعض کو اہم نہیں سمجھتا۔ جن چیزوں کو معاشرہ اہم سمجھتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے۔ وہی اس کی معاشرتی قدریں ہوتی ہیں۔ جیسے مَیں نے عرض کیا۔ اِن قدروں میں عقائد شامل ہیں، معاشرے کے مستقبل کے متعلق ان کے خواب یا آئیڈیلس اور آدرش شامل ہیں۔ اِسی طرح ان کی امنگیں اور امیدیں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان عقائد، امیدوں اور خوابوں کے بارے میں ان کے جو جذبات ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ یہ سب جو باطنی نظام ہے اچھائی اور بُرائی کا، خوبصورتی اور بدصُورتی کا، سلیقے اور بدسلیقگی کا۔ یہ سب ان کے کلچر کا باطنی پہلو ہے۔ ظاہری پہلو وہ ہوتا ہے جب وہ ان قدروں، ان جذبات اور ان عقائد کا اپنی زندگی میں اظہار کرتے ہیں۔

ظاہری نظام کے شعوری اور غیر شعوری اجزا پر بھی غور کر لیں۔ غیر شعوری صُورت جو کہ ناتراشیدہ صورت ہے اس میں زندگی کا جتنا کاروبار ہے وہ سب شامل ہے۔ لباس ہے، زبان ہے، خوراک ہے، رہائش کے طریقے ہیں، رسم و رواج ہیں، آپس میں ملنے جُلنے کے طریقے ہیں۔ غرض یہ کہ زندگی کا جتنا روزمرّہ ہے جس کو انگریزی میں دے آف لائف کہتے ہیں۔ وہ سب۔ زندگی کا تمام روزمرّہ کسی معاشرے کے کلچر کی ناتراشیدہ صُورت ہے کیونکہ جب کوئی آدمی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے یا خاص قسم کا کھانا کھاتا ہے اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا ہے کہ مَیں کلچر کا کام کر رہا ہوں۔ وہ تو غیر شعوری بات ہے۔ اُس کے کلچر کا غیر شعوری حصّہ ہے۔ وہ تو روزمرّہ کے طریقے سے عمل کرتا ہے اور بس۔

ظاہری پہلو کی ایک تراشیدہ اور شعوری صورت ہوتی ہے۔ وہ ہیں فنون۔ مثلاً مصوّری یا شاعری یا ظروف سازی یا فنِ تعمیر۔ تین چیزیں ہیں۔ ایک تو باطنی طور پر معاشرہ ایک خاص طریقے سے محسّوس کرتا، خاص طریقے سے چیزوں کو دیکھتا اور خاص طریقے سے ان پر غور کرتا ہے۔ وہی جو فکر کا طریقہ ہے یعنی دیکھنے، سوچنے اور اچھّائی اور بُرائی کا معیار پرکھنے کا طریقہ جو اس کی ظاہری زندگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہری زندگی میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن پر معاشرے کے لوگ غور نہیں کرتے اور وہ غیر شعوری طور پر اُن سے سرزد ہوتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ بعض چیزیں لوگ شعوری طور پر مختلف صُورتوں اور مختلف سانچوں میں ڈھالتے ہیں، جیسے شعر کہتے ہیں، ناول لکھتے ہیں، تصویریں بناتے ہیں، ڈرامے لکھتے ہیں وغیرہ۔ ان صُورتوں کے ملنے ملانے سے جو چیز بنتی ہے اس کو آپ کلچر کہتے ہیں۔

یہاں تک تو تعریف ہوئی کلچر کی تجریدی طور سے، ایبسٹریکٹ طور سے۔ اب سوال یہ ہے کہ قومی کلچر یا قومی تہذیب کیا چیز ہے؟ تہذیب کی، جیسے کہ مَیں نے عرض کیا ایبسٹریکٹ صُورت سوسائٹی کا رہن سہن، ان کے قاعدے، ان کے رسوم، ان کے فنون اور ان کی ذہنی اچھائی اور بُرائی کے معیار ہیں۔ کلچر کی یہ عمومی تعریف ہر کلچر پر صادق آتی ہے۔

قومی کلچر کیا ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ پہلے تو قوم ہونی چاہیئے جس کا کلچر قومی کلچر کہلائے۔ پھر اُس قومی کلچر کو متعیّن کرنے کے لیے اُسے دوسری قوموں کے کلچر سے کئی طریقوں سے مخصوص کریں۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ کلچر کو ایک ایسی شے تصوّر کریں جس کی میز یا کرسی کی طرح تین حدود ہیں۔ ایک تو اس کا طول، دوسرے اس کا عرض، تیسرے اُس کی گہرائی۔ اب اس کی تفصیل۔

کلچر کا طول یا تہذیب کا طول تو وہ ہے جو کہ اس قوم کی تاریخ ہے۔ تاریخ کا تعلق وقت اور زمانے کے ساتھ ہے۔ کوئی قوم جس تاریخی نقطے سے اپنی تاریخ کی ابتدا کرتی ہے

اُس وقت سے لے کر اب تک کا زمانہ اس کے کلچر کا طول ہے۔ کوئی قوم اپنی تاریخ ہزار سال پہلے سے شروع کرتی ہے، کوئی دو ہزار سال پہلے اور کوئی تین ہزار سال پہلے وغیرہ۔ یعنی اُس نقطے تک جہاں تک وہ تاریخ کو اپنی تاریخ سمجھتی ہے۔ مثلاً انگریز اپنی تاریخ کم و بیش اُس زمانے سے شروع کرتے ہیں جب کہ سب سے پہلے اس علاقے میں داخل ہوئے۔ فرانسیسی اُس زمانے سے شروع کرتے ہیں جب گالز نے سب سے پہلے فرانس کی طرف ہجرت کی۔ ایرانی تختِ جمشید سے شروع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر قوم خود تصوّر کرتی ہے اور خود فیصلہ کرتی ہے کہ اس کی تاریخ وقت کے کس نقطے سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک تو ہوا کلچر کا طول۔

کسی قوم کے کلچر کے عرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم اپنی جغرافیائی حدود کہاں مقرر کرتی ہے۔ وہ جہاں بھی اپنے وطن کی حدود مقرر کرتی ہے یا اپنے کلچر کی زمینی حد، ارضی حد مقرر کرتی ہے اس کو کلچر کا عرض کہہ لیجے۔

کلچر کی گہرائی کا مسئلہ۔ یعنی یہ کہ کسی کلچر کی رسائی کسی معاشرے میں کہاں تک ہے۔ اس کا نفوذ یا اُس کا رسوخ کسی معاشرے کی آبادی کے کتنے حصّے تک ہے؟ جس چیز کو ہم یا کوئی دوسری قوم اپنا قومی کلچر کہتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کلچر تک اس قوم کے صرف پانچ یا دس فیصد افراد کو رسائی ہو اور باقی عوام کو اس کلچر میں کوئی حصّہ نہ ملے یا ان کا کوئی حصّہ نہ ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں میں مختلف قسم کی تہذیبیں یا کلچر رائج ہوں۔

عام طور سے ان تینوں چیزوں یا حدوں یعنی تصوّر کردہ طول عرض اور گہرائی اور فی الحقیقت تاریخ، جغرافیہ اور رسائی سے مل کر جو چیز پیدا ہوتی ہے۔ اسے کوئی قوم اپنا مخصوص کلچر کہتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اُس کلچر کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے، اُس کی جغرافیائی حد یہ ہے اور اس کی مقبولیت، نفوذ یا رسائی کی حد اتنی ہے۔

یہ تو سمجھئے کلچر کا وہ مفہوم ہے جس کو آجکل بیشتر ممالک تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے دو چار مسائل خاص طور پر ہمارے لیے باعثِ توجہ ہیں۔

سب سے پہلے مسئلہ تو یہی ہے کہ کلچر اور دین کا باہم رشتہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں یہ بہت بنیادی مسئلہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے کلچر کی بنیاد ہمارا دین ہے۔ دین باطنی چیز ہے۔ دین کی وجہ سے زندگی کی بہت قدریں متعین ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کلچر کے بہت سے اجزا ایسے ہیں جن کو مذہب یا دین متعین نہیں کرتا۔ خاص طور پر مذہب اسلام متعین نہیں کرتا۔ بعض مذاہب ایسے ضرور ہیں جن کا تعلق کسی نسل سے ہے۔ یا کسی جغرافیہ سے ہے جیسا کہ ہندو مذہب یا صیہونی مذہب ہے۔ اور اس کا تمدن ہے جس میں کہ نسل کو براہِ راست دخل ہے لیکن ہمارا مذہب اور اسی طریقے سے مسیحیت، عالمگیر مذاہب ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اسلام یا مسیحیت کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے۔ چونکہ آپ ان کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے اس لیے مختلف اسلامی ممالک کی تہذیبیں یا کلچر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایرانی کلچر یا ایرانی تہذیب وہ نہیں ہے جو انڈونیشیا کی تہذیب ہے۔ یا جو سوڈان کی تہذیب ہے وہ مصر کی تہذیب نہیں ہے۔ ان تہذیبوں کے ایسے حصّوں میں مذہب یا دین کا تعلق نہیں جن کا تعلق قومیت سے ہے۔ ہمارا دین یہ حکم نہیں دیتا کہ تم کونسی زبان بولو، پنجابی میں گفتگو کرو یا فارسی میں کرو یا عربی میں۔ زبان ہر ملک کے کلچر کا بنیادی عنصر ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے ہمارا دین کسی پر یہ حکم عائد نہیں کرتا کہ تم کس طریقے کا مکان بناؤ یا کس طریقے کا لباس پہنو یا کہ تم کس طریقے سے کھانا پکاؤ۔ چنانچہ اگر ہم کلچر کو زندگی کا روزمرّہ سمجھیں اور اس میں فنون کے علاوہ وہ سب چیزیں شامل کر دیں جو کہ لوگوں کی زندگی کا حصّہ ہیں تو ظاہر ہے اُن میں بہت سی ایسی ہوں گی جن کے بارے میں دین کوئی حکم صادر نہیں کرتا۔

ایسی چیزوں کے بارے میں جب آپ اپنے کلچر کی نوعیت یا ماہیّت متعین کریں۔

گے تو لازماً آپ کو دین کی بجائے قومیت کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ کم از کم ہمارا دین اور قومیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے کہ ہمارا دین عالمگیر ہے۔ جس چیز کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں یا اسلامی فنِ تعمیر یا اسلامی ادب وہ ہر جگہ کسی نہ کسی قومی سانچے میں ظاہر ہوا ہے۔ کلچر بجائے خود تو ہوا میں زندہ نہیں رہتا اور باطنی طریقے سے اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کا اظہار ہمیشہ قومی طریقے سے ہوتا ہے۔ دینِ اسلام جس جس ملک میں پہنچا ہے۔ اس کی تہذیب کا اظہار وہاں کے قومی سانچے میں ڈھل کے ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ ایرانیوں نے اسلام کے زمانے میں بہت فن پیدا کیا، بڑی تہذیب پیدا کی۔ مصریوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد کافی بڑی تہذیب پیدا کی۔

پاکستانی تہذیبی مسئلے کے دو پہلو اور بھی ہیں۔ ایک تو وہ جس کا تعلق براہِ راست ہمارے اخلاق اور عقائد سے ہے۔ وہ قدریں تو نہ صرف مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مشترک ہیں بلکہ وہ قدریں ہماری ساری ملّتِ اسلامی میں مشترک ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ وہ اجزاء کونسے ہیں جن کا تعلق پاکستان سے ہے۔، جو یہاں کے مقامی حالات سے پیدا ہوئے اور جن کا یہاں کی تاریخ اور یہاں کے جغرافیہ سے تعلق ہے۔ وہ کونسے عناصر ہیں اور اُن میں ایسے کونسے اجزاء ہیں جنکو ہم یکجا کر کے ایک مشترکہ پاکستانی تہذیب کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ یہ دونوں مسئلے الگ الگ طریقے سے سوچنے کے ہیں۔ اُسی کے بعد ہم کسی ایک نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ پاکستانی تہذیب کی ماہیّت کیا ہونی چاہیئے۔ اس کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مَیں یہاں تک ہی بات کروں کیونکہ اس کے بارے میں اگر کسی وضاحت کی ضرورت ہو تو وہ ہو جائے۔ اس کے بعد ہم ماہیّت مستقبل وغیرہ پر گفتگو کریں گے۔

اس کے بعد حاضرین نے سوالات کیے اور مقرّر نے جوابات دیئے:

سوال: کیا ہم پاکستانی تہذیب کو اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے؟

جواب : اسلامی کلچر میں کچھ تو عقائد ایسے ہیں جن کی نوعیت باطنی ہے اور کچھ ان کی ظاہری صورتیں ہیں کہ تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کے مطابق قومی ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ الگ الگ ہیں، بلکہ یہ دونوں اجزاء مل کے قومی تہذیب کہلاتے ہیں۔ چنانچہ پاکستانی تہذیب تو پاکستان تک محدود ہے اور اسلام قومیت پر محدود نہیں۔ کسی ایک ملک یا ایک قوم پر محدود نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔ اور پاکستانی تہذیب صرف پاکستان تک محدود ہے چنانچہ جو پاکستانی تہذیب ہوگی وہ اسلامی تہذیب ہوگی، غیر اسلامی نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ اس کو پاکستانی اسلامی تہذیب کہہ لیجئے۔ آپ صرف اسلامی تہذیب اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا اجارہ اسلام پر نہیں ہے۔ اس پر دیگر اسلامی ممالک کا بھی حق ہے۔ اس وقت جو میں نے تہذیب کی عام تعریف کی ہے، میں چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی سوال کیا جائے۔

ایک سوال غالباً تاریخ اور جغرافیہ کی حیثیت سے متعلق تھا کہ وہ کس حد تک کلچر کو متعین کرتے ہیں۔

جواب : مجھے پہلے وضاحت کر دینی چاہیئے تھی کہ جب ہم تاریخ اور جغرافیہ کی بات کرتے ہیں تو یہ معاشرے کی قطعی حدود نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ کوئی قومی تہذیب، اگر اس میں جان ہے، زندگی ہے تو وہ کسی خاص جغرافیائی سرحدوں میں محدود نہیں رہتی۔ اس کے اثرات دُور دُور تک پہنچتے ہیں اور دوسری تہذیبیں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ جہاں تک تاریخ کا سوال ہے جس نقطے سے تاریخ کو شروع کرتے ہیں۔ وہ فرضی نقطہ ہوتا ہے اس لیے کہ تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے سب ہی تاریخیں ایک ہی نقطے سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن ہر قوم اپنے شعور کے مطابق یا اپنی پسند سے ایک نقطہ فرض کر لیتی یا اختیار کر لیتی ہے کہ ہماری تاریخ یہاں سے شروع ہوتی ہے یا یہاں تک پہنچتی ہے۔ وہ کوئی قطعی نہیں بلکہ فرضی نقطہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جو جغرافیائی حدود کسی تہذیب کی ہوتی ہیں تہذیب ان کے اندر مقید نہیں رہتی تہذیب

اس کے باہر بھی جاتی ہے اور باہر کی تہذیبیں ان حدُود کے اندر بھی پہنچتی ہیں۔ قوم اپنے لیے ایک حد، سرحد مقرر کر لیتی ہے۔ اِس لیے اس حد، سرحد کو تہذیب کے جغرافیائی حدود کہہ سکتے ہیں۔ کوئی طاقت اس تہذیب کو اُن حدُود کے باہر جانے سے بھی نہیں روک سکتی۔ مثلاً یورپ کو لیجیے۔ سب ملک، انگلستان، فرانس جرمنی، یونان اپنی تہذیب کو یونان سے شروع کرتے ہیں لیکن کوئی انگلستانی یہ نہیں مانتا کہ اس کی اپنی تہذیب نہیں ہے یا اس کے جغرافیائی حدود نہیں ہیں۔ اِسی طرح فرانسیسی بھی نہیں مانتے کہ ان کی الگ تہذیب یا جغرافیائی حدود نہیں ہیں حالانکہ بہت سی چیزیں اور بہت سے اجزاء ایسے ہیں۔ جو ان سب میں مشترک ہیں۔ یونانی تہذیب کی بہت سی چیزیں ان ملکوں کی تہذیبوں میں مشترک ہیں۔ ہر ملک نے اپنی قومی تہذیب کے لیے ایک دائرہ مقرر کر رکھا ہے۔

سوال: کیا تہذیب کے قومی اور بَین الاقوامی اجزاء میں تمیز ممکن ہے؟

جواب: بَین الاقوامی کلچر میں جو تین چار چیزیں مَیں نے گنوائی ہیں ان میں کچھ ایسی ہیں جو صرف قومی ہو سکتی ہیں بَین الاقوامی نہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ملک کو لیجیے۔ ہمارے دیہات میں جو رہن سہن کا طریقہ ہے یا جس قسم کے برتن وہاں بنتے ہیں یا جس طریقے سے وہاں کے لوگ دودھ دوہتے رہیں یا شادی بیاہ کی رسومات ادا کرتے ہیں۔ وہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کو آپ عالمگیر بنا سکتے ہیں۔ یا جن کو آپ بین الاقوامی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک آپ کی شاعری، فنون یا آپ کے سینما کا تعلق ہے جن کی مقبولیت باہر کی دُنیا میں بھی ہو سکتی ہے۔ ان میں ایسے عناصر ضرور نکلیں گے جو بین الاقوامی ٹھہرائے جا سکیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کی باطنی زندگی کا سب سے بڑا عُنصر آپ کا عالمگیر دین ہے۔ وہ تو بَین الاقوامی ہے، وہ تو پاکستانی نہیں ہے۔ چنانچہ ہر کلچر میں یا کم از کم ہمارے کلچر میں ایسے اجزاء بھی ہیں جو بَین الاقوامی ہیں۔ اور ایسے اجزاء بھی ہیں جو قومی ہیں۔ قریب قریب ہر اچھی تہذیب میں یہی صورت ہوتی ہے کہ بعض عناصر بَین الاقوامی ہو جاتے ہیں۔

جن کی صلاحیت اِس قسم کی ہو کہ ان کو باہر بھی مقبولیت حاصل ہو سکے اور بہت سے اجزاء ایسے ہوتے ہیں جو مقامی اور قومی ہوتے ہیں اس لیے ان کا براہِ راست تعلق وہاں کے قومی حالات سے ہوتا ہے۔

سوال : کلچر کا اقتصادی اور سیاسی نظام سے کیا تعلق ہے؟

جواب : کلچر میں اقتصادی نظام اور سیاسی نظام ایک حد تک شامل ہیں۔ آپ کی زندگی کا جملہ روزمرّہ آپ کا کلچر ہے۔ ظاہر ہے اس میں سیاست اور اقتصادیات بھی شامل ہیں لیکن اس کو ہم اِس طریقے سے تمیز کرتے ہیں کہ جو آپ کا سیاسی یا اقتصادی نظام ہے اس سے زندگی میں جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور جن کی نوعیت یا ماہیّت تہذیبی ہے وہ کلچر ہے لیکن سیاست اور اقتصادیات بجائے خود کلچر کا حصّہ نہیں۔ اِن چیزوں کی وجہ سے ایک نظام میں جس خاص طرح کا کلچر پیدا ہو سکتا ہے۔ ویسا ہی کلچر دوسرے نظام میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ کے کلچر یا تہذیب کا بہت حد تک انحصار آپ کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان دونوں چیزوں کو الگ الگ کر سکتے ہیں۔ آپ حکومت کِس طرح چلاتے ہیں اس کو ہم کلچر کا حصّہ نہیں سمجھتے لیکن آپ کے حکومت چلانے کی وجہ سے آپ کے لوگوں کی زندگی اور ان کے ذہنوں پر جو اثر پڑتا ہے اس کو ہم آپ کے کلچر کا حصّہ سمجھتے رہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجے کہ سیاسی اور اقتصادی نظام ایک بنیاد ہے اور اس پر جو معاشرتی عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ کلچر ہے۔

سوال : قوم اور قومیت میں کیا فرق ہے؟

جواب : اٹھارہویں صدی سے پہلے ہمارے ہاں قوم کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ یورپ میں بھی 'جمہوریت' جمہوری نظام اور طبقوں کا کوئی تصوّر نہیں تھا بلکہ قوم کا تصور بھی بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔ اِس سے پہلے یعنی اٹھارہویں یا سترہویں صدی سے پہلے قبائل ہوتے تھے، نسلیں ہوتی تھیں یا جماعتیں۔ قوم کا تصوّر اس وقت پیدا ہوا جب قومی حکومتیں

پیدا ہوئیں۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد قوم کی مختلف تعریفیں کی گئیں لیکن مروجہ تعریف یہ ہے کہ کوئی گروہ جس کے مفادات آپس میں مشترک اور جس کی روایتیں عقائد اور جذبات آپس میں منسلک ہوں، جو اکائی کے طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہے اُسے قوم کہتے ہیں قوم کے اندر مختلف فرقے بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف طبقے بھی۔ ان فرقوں یا طبقوں کے لیے انھوں نے ایک نیا نام وضع کیا نیشنلٹی۔ یعنی قومیت۔ ایک تو ہوتی ہے قوم جو کہ جغرافیائی حدود میں مشترکہ مفادات کی وجہ سے، مشترکہ تہذیب کی وجہ سے اور مشترکہ عقائد کی وجہ سے ایک جگہ رہنا چاہتی ہے۔ اس قوم کے اندر قومیتیں ہوتی ہیں۔ یعنی مختلف فرقے یا طبقے۔ قومیت کا لفظ اب سے کوئی پچاس سال پہلے پیدا ہوا۔ اس سے پہلے قومیت کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

سوال: کیا تقسیم سے پہلے ہندوستان میں ایک کلچر تھا؟

جواب: سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ایک کلچر نہیں تھا۔ ہندوستان میں صرف دو نہیں بلکہ بیس کلچر تھے اور اِس وقت بھی موجود ہیں اور اسی لیے ہندوستان میں اس وقت تک وہ سارے فسادات موجود ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کلچر تھے لیکن ان میں کچھ باتیں مشترک بھی تھیں اور بہت سی چیزیں مختلف بھی۔ چونکہ ایک کلچر نہیں تھا اِسی لیے پاکستان بنا اور اسی وجہ سے ممکن ہے ہندوستان میں تین چار بڑے ٹکڑے اور ہوں اور بہت ممکن ہے کہ ہندوستان ایک ملک نہ رہے۔ اس میں مزید تقسیم ہو۔

سوال: اگر دنیا کو کلچر کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو کتنے کلچر ہو سکتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک تو کلچر کی ایبسٹریکٹ تعریف ہے۔ وہ کلچر تو ساری دنیا کا ہے۔ باقی قومی کلچر ہوتا ہے۔ دُنیا میں جتنی قومیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا کلچر ہے یا ہونا چاہیے کیونکہ قوم کے بغیر قومی کلچر پیدا نہیں ہو سکتا اور قومی کلچر کے بغیر

کوئی قوم نہیں ہوتی۔ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کسی قوم کا قومی کلچر نہیں تو وہ قوم نہیں رہے یا قوم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ آپ جتنی قومیں تسلیم کریں گے اتنے ہی کلچر بھی تسلیم کریں گے۔

سوال : دین اسلام عالمگیر حقیقت ہے اور قومیت کا قائل نہیں ہے اس لیے اگر ہر اسلامی ملک کی تہذیب اپنے جغرافیائی حالات کے تحت پیدا ہوتی ہے اور وہ تہذیب اسلامی نہیں ہو سکتی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ اسلامی تہذیب نام کی کوئی تہذیب موجود نہیں۔

جواب : اسلام چونکہ عالمگیر مذہب ہے اس لیے ہر مسلمان قوم کا کلچر اسلامی کلچر ہے۔ ہر مسلمان قوم کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر اسلامی ملک کی ایک قومی تہذیب بھی ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مثلاً ایران ایک مسلمان ملک ہے۔ اسلیئے ایرانی تہذیب اسلامی بھی ہے اور ایرانی بھی۔ انڈونیشیا کی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہے اور انڈونیشیائی بھی۔ اسی طریقے سے پاکستانی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہوگی اور پاکستانی تہذیب بھی۔ لیکن آپ کسی قوم کی تہذیب کو اس طریقے سے اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے کہ وہ ساری دنیا کے اسلام کی تہذیب ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسلامی تہذیب کوئی چیز نہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہر اسلامی ملک کی تہذیب اسلامی ہے۔

سوال : کیا اسلام کسی تہذیب پر اثر انداز نہیں ہوتا؟

جواب : یہ میں نے کب کہا ہے کہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ تاریخی لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عرب کے خطے سے نکل کر جہاں بھی پہنچا اس نے اسلامی تہذیب کو جامعیت سے جنم دیا۔ میں نے تہذیب کا جو پہلا حصہ مقرر کیا یعنی باطنی حصہ اس میں مذہب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ دین اسلام کا قومی تہذیبوں پر اثر نہیں ہوا۔ جہاں بھی ہمارا دین پہنچا ہے اس نے وہاں کے معاشرے میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ اور اس انقلاب کی وجہ سے مختلف اسلامی ممالک کی قومی تہذیبوں میں ایک نہایت بنیادی فرق پیدا ہوا۔

اِسی قسم کا بنیادی انقلاب اسلام کے آنے کے بعد ہندوستان کی تہذیب میں بھی پیدا ہوا جس کی وجہ سے یہاں کے وہ لوگ جو کہ مسلمان ہیں ان کی تہذیب یہاں کے ان لوگوں سے جو کہ غیر مسلم تھے الگ ہو گئی۔ اُسی کی بنیاد پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔

سوال : آپ تہذیب کا لفظ کلچر کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جب کہ اس کا مفہوم انگریزی میں سی وی لی زیشن کا لفظ ادا کرتا ہے ؟

جواب : مَیں نے عرض کیا تھا کہ کلچر کے لیے ہمارے ہاں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پُرانا لفظ تہذیب ہے جس کو ہم سی وی لی زیشن اور کلچر دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے لطیفہ سُنا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں ہمارے ہاں کا کلچر صرف ایگریکلچر ہے۔ جن صاحب نے یہ لطیفہ تخلیق کیا انہیں کلچر کے معنی نہیں آتے تھے اسلیئے کہ کلچر کا ماخذ ہے ہی ایگریکلچر۔ اصل لاطینی لفظ کے معنی جس سے ایگریکلچر بنایا گیا ہے، کھیتی باڑی ہیں۔ اس زمانے میں یہ لفظ موجودہ معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے کلچر ناؤن کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اِسے کسی چیز کو بہتر کرنے یا اس کی تربیت کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً آپ کسی پودے کی نشوونما کرتے ہیں۔ یا جانور یا کسی اور چیز کی، تو اس کیلئے لفظ کلچر استعمال ہوتا ہے۔ جب قوم کا تصور نہیں تھا تو کلچر کا تصور کیسے آتا؟ کلچر کا تصور تو قوم کے تصور سے پیدا ہوا۔ مَیں تہذیب کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ وہ نسبتاً کلچر کے قریب ہے۔ کلچر کے معنی جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں اور جو پرانے زمانے میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ کسی چیز یا کسی ادارے کی بہتر یا ترقی یافتہ صُورت پیدا کرنا ہے اور تہذیب کے بھی معنی ایک لحاظ سے یہی ہیں کہ کسی شخص یا ادارے یا کسی معاشرے کی شائستہ صُورت پیدا کرنے کے لیے اس کی تربیت کرنا۔ انگریزی میں سی وی لیزیشن کا لفظ پرانا اور کلچر کا لفظ مقابلتاً نیا یا بعد کا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے تہذیب کا لفظ محض ذاتی معنوں میں استعمال ہوتا تھا یعنی اپنی ذات کی شائستگی۔ بات اصل یہ ہے کہ ہر اصطلاح کی تعریف تو ہم خود بیان

کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ثقافت کا لفظ استعمال کرلیں۔ مَیں تہذیب کو کلچر کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں لیکن مجھے اصرار نہیں ہے کہ اس کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہوسکتا۔

سوال : آپ نے کلچر، ثقافت اور تہذیب کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا ہے؟

جواب : جی ہاں۔ ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ میرے نزدیک سی وی لیزیشن کے لیے تمدّن کا لفظ موزوں ہے۔ کیونکہ تمدّن کا تعلق معاشرے کی مدنیت سے ہے یعنی رہنے سہنے کا طریقہ۔ اور سی وی لیزیشن بھی ایک حد تک تمدّن کے معنوں ہی میں مستعمل ہوتا ہے۔ آجکل عربی لکھنے والے بھی اس کو اسی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ سی وی لیزیشن ایک COLLECTIVE لفظ ہے جس کو آپ معاشرے کی ترقی کی ایک خاص سطح کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ کلچر زیادہ جامع لفظ ہے جس کے بہت سے اجزا ہیں جو کہ تمدّن یا سی وی لیزیشن میں شامل نہیں ہیں۔

سوال : اِسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے۔ کیا جغرافیائی حدیں ہماری اقدار کو پھاندنے میں کامیاب ثابت ہو رہی ہیں؟

جواب : مَیں نے بھی یہی عرض کیا ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس کا کسی خاص یا ایک قوم کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ اسلیئے آپ اس کو کسی قومی حدود میں مقیّد نہیں کرسکتے۔ قومیں موجود ہیں اور ان قوموں کے اپنے دین یعنی اسلام کے علاوہ ان کی اپنی دنیاوی زندگی ہے۔ انھیں اس کے انضباط کے بارے میں بھی غور کرنا ہے۔ دنیوی زندگی کے انضباط میں ایک شعبہ کلچر کا ہے جس کے بارے میں ہم نے اس وقت گفتگو کی۔

سوال : کیا قومی کلچر پوری قوم کا کلچر ہوتا ہے؛ یا حکمران طبقے کا کلچر قومی کلچر کہلاتا ہے؟

جواب : آج تک ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی حکمران طبقے کا کلچر قومی کلچر ہے (مَیں یہ نہیں کہتا کہ یہ اچھی بات ہے) اچھا کلچر تو وہی ہے جس میں عوام کا بیشتر حصّہ شامل ہو۔ عام

طور پر صاحبِ اقتدار طبقے کے کلچر کو قومی کلچر کہا جاتا ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں تھی کہ یہ تعریف صحیح ہے۔ بعض معاشروں میں بہت تھوڑے سے لوگ مہذّب کہلاتے ہیں اور باقی لوگوں کو تہذیب میں حِصّہ نہیں ملتا۔ وہی تھوڑے سے لوگ اپنے کلچر کو قومی کلچر ٹھہراتے ہیں۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ جب ہم پاکستانی کلچر کو متعیّن کرنے بیٹھیں تو ہمیں اس مغالطے میں مُبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہمیں پاکستانی تہذیب سے وہی تہذیب مراد لینی چاہیئے یا ایسی ہی تہذیب تشکیل کرنی چاہیئے جس میں نہ صرف امرا شامل ہوں بلکہ جس میں عوام الناس کا بھی کوئی حِصّہ ہو۔

دوسری تقریر

پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی

ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے اس کے آداب اور اس کے اخلاقِ ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس یا مستحسن سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر جب اس معاشرے کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں، تو یہ اقدار بھی اس کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور پھر انہی عقائد اور احساسات کا اظہار مختلف فنون کرتے ہیں لیکن ان فنون سے بھی لوگوں کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ تینوں عوامل ایسے ہیں جو ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور آپس میں منسلک بھی رہتے ہیں۔

جب آپ قومی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں، تو پھر آپ کلچر یا تہذیب کے خصائص پر بعض عمومی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ کہ اس قوم کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے اور اس قوم کی معاشرت کا انداز کیا ہے ایک قوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تہذیب دوسری قوموں کی تہذیب سے جُدا ہوتی ہے۔ جس طریقے سے کلچر کے تین پہلو ایک دوسرے سے منسلک ہیں اسی طرح قوم اور کلچر یا قومیت اور تہذیب بھی لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کہ آپ کسی ایسی قوم کا تصور نہیں کر سکتے جس کی کوئی تہذیب نہ ہو اور نہ ہی آپ کسی تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی قوم یا گروہ سے وابستہ نہ ہو۔ اب یہ ساری باتیں ذہن میں رکھیے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ پاکستان کی قومی تہذیب کی ماہیت اس کی موجودہ صورت اور اس کے اجزاء کیا ہیں؟۔

ایک بات واضح ہے کہ پاکستان کی قومی تہذیب پاکستان کی تہذیب ہے، یعنی اس قوم کے امتیازی نشانات کیا ہیں جو اس کو دوسری قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ ایک تمیز تو اس کے نام سے ہی

ظاہر ہے۔ پاکستانی قوم کی دو امتیازی خصوصیات ہیں، ایک یہ کہ وہ پاکستانی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی اکثریت مسلمان ہے۔ تو گویا دو ترکیبی عناصر ہوئے آپ کی قومیت کے، جس میں سے ایک کو تو پاکستانیت کہیے اور دوسرے کو اسلامیت یا مسلمیت۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں کی تہذیب کے جو تین پہلو ہم نے متعین کئے تھے یعنی تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی نفوذ، ان کی کیفیت پاکستانی قوم میں کیا ہے؟۔

یہاں سے ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں اس لئے کہ سیاسی اعتبار سے اس گروہ کی عمر صرف ۲۹ برس ہے۔ جس کو قوم کہتے ہیں آج سے ۲۹ برس پہلے جب کوئی پاکستان ہی نہ تھا تو ظاہر ہے کوئی پاکستانی قوم بھی نہیں تھی، لیکن وہ خطہ جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اس کی تاریخی عمر پانچ ہزار سال ہے جو کہ ہم موہنجوڈارو سے شروع کرتے ہیں۔ اب پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو یعنی دس ہزار برس کی عمر کو ہم ایک دوسرے سے کیسے مطابق کریں اور اس میں کس قسم کی مطابقت پیدا کرنی چاہیئے سب سے پہلے ہم یہی پوچھ سکتے ہیں کہ ۲۹ برس پہلے جب پاکستانی قوم نہیں تھی، تو ہم کیا تھے؟ اس کے پہلے بھی تو آخر کوئی ہماری تعریف ہوگی۔ کوئی ہمارا نام ہوگا تو وہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے ہمارے نام دو طرح کے تھے اور دو طرح سے ہمیں پہچانا جاتا تھا۔ تہذیبی اعتبار سے ہمارے نام مختلف علاقوں کے نام تھے، یعنی ہم پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور بنگالی تھے، لیکن ہم پاکستانی نہیں تھے اور سیاسی اعتبار سے ہم ہندوستانی مسلمان تھے تو اس طرح بھی پاکستانی مسلمان نہیں تھے۔ ویسے جو ہمارے علاقائی اعتبار سے پہلی جو تعریف تھی اس کا حلقہ پاکستان سے چھوٹا تھا اور جو دوسری تعریف تھی یہی ہندوستانی مسلمان کے اعتبار سے تو اس کا حلقہ پاکستان کی موجودہ قوم سے زیادہ وسیع تھا۔ چنانچہ پہلی مشکل جو ہمیں درپیش ہے وہ بہت سی قوموں کو درپیش نہیں ہے یعنی ۲۹ برس میں ایک مخصوص تہذیب کے خدوخال کو بیان کرنا۔ دوسرے ملکوں کو یہ مشکل اس لئے درپیش نہیں ہے کہ دنیا کی بیشتر قومیں جیسے جیسے پروان چڑھتی گئیں، ان کا نشوونما ہوتا گیا۔ ویسے ہی ان کی تہذیب بھی ترقی کرتی گئی اور پروان چڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک خاص وقفے کے بعد اس کی قومیت اور تہذیب کی شخصیت اور انفرادیت مخصوص ہوگئی؟ چنانچہ ایرانی، مصری، سوڈانی یا عراقی لوگوں کو ہماری جیسی مشکل درپیش نہیں۔

ہمیں یہ مشکل کیوں درپیش آئی ؟ اس لئے کہ قوم کا تصوّر دنیا بھر میں نسبتاً نیا ہے اور یہ تصوّر اس وقت پیدا ہوا جبکہ پہلی دفعہ جمہوریت کا تصوّر پیدا ہوا۔ یہ دونوں تصورات قریب قریب دو سو برس پرانے ہیں۔ اس سے پہلے ساری دنیا میں جاگیرداری FEUDAL یا نوابی نظام رائج تھا۔ اس وقت قوموں کا تصوّر نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت یا تو حسب و نسب کا تصور تھا یا نسل کا تصوّر تھا یا قبیلے کا تصوّر تھا، لیکن کلّی طور پر کسی ایک قوم میں قومیت کا تصوّر نہیں تھا اور قوم کا تصوّر اس لیے نہیں تھا کہ اس وقت معاشرہ اس کے عوام، خواص، امرا اور ان کی رعایا میں بٹا ہوا تھا اور ان دو طبقوں کی تہذیبیں الگ الگ تھیں۔ ان کے معاشرتی آداب بھی الگ الگ تھے۔ ان کا آپس میں ربط سیاسی نوعیت کا تھا سماجی ربط بہت کم تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جتنے بھی ملک اور ان میں جتنی بھی تہذیبیں تھیں وہ یا نسل کے نام پر تھیں یا خاندانوں یا بادشاہوں کے نام پر تھیں پہلی دفعہ کسی معاشرے کے مجموعی طور پر ایک قوم سمجھنے کا تصوّر اس وقت پیدا ہوا جب کہ مجموعی طور پر سب لوگ نظریاتی اعتبار سے برابر اور ان کے حقوق ایک طریقے سے مساوی سمجھے جانے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ جاگیردارانہ نظام ختم اور اس کی بجائے جمہوری نظام یا صنعتی نظام رائج ہوا۔

ہمارے ہاں یہ اس لئے نہ ہو سکا کہ پیشتر اس کے کہ ہمارے ہاں جاگیرداری یا بادشاہی نظام ترقی یافتہ صورت اختیار کرتا، ہم غلام ہو گئے اور غیر ملکی حکمران یعنی انگریز ہم پر قابض ہو گئے اور انہوں نے اپنے معاشرتی یا سیاسی تصوّر کے مطابق ہم پر حکمرانی شروع کر دی۔ یہ عمل کوئی ابھی سے نہیں ہوا بلکہ سولھویں صدی کے بعد جبکہ یورپی ممالک طاقتور ہوئے اور انہوں نے امپیریلزم یا سامراجیت کی بنا ڈالی اور جہاں جہاں بھی وہ پہنچے انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک معاشرتی ترقی کی جس سطح پر پہنچا ہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے اور اس کا نظام، جو بھی اس وقت کا نظام ہے وہ وہیں کا وہیں منجمد ہو جائے اور اس میں آگے حرکت نہ ہو سکے۔ چنانچہ اگر وہ کسی قبائلی علاقے میں پہنچے جہاں بہت ہی پرانا قبائلی نظام رائج تھا تو وہاں وہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ نظام وہاں پہ قائم ہے اگر وہ کسی ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں پر جاگیرداری یا نوابی نظام رائج تھا تو انہوں نے کوشش کی کہ اس نظام کو وہیں منجمد

کر دیا جائے اور اس کی معاشرتی اور سیاسی ترقی یافتہ صورتیں پیدا نہ ہوں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے اور جس نظام پر انہوں نے قبضہ جمایا۔ اس کی جو بُری باتیں تھیں، جو پیچھے لے جانے والی باتیں تھیں جو پسماندہ رکھنے والی باتیں تھیں ان کو قائم رکھا اور اس کی جو خوبیاں تھیں اس میں جو محاسن تھے ان کو زائل کر دیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی یہی ہوا کہ جب انگریز یہاں آئے تو اس وقت جو ہمارا کافی ترقی یافتہ جاگیرداری نظام یہاں رائج تھا۔ اس کی خوبیاں مثال کے طور پر آپس میں وضع داری، رکھ رکھاؤ، مروت، نفاست پسندی، علم پروری، ہنر دوستی۔ یہ سارے خصائص اس نظام کے انہوں نے ختم کر دیئے اور اس کی بُری باتیں مثلاً دربار داری، خوشامد پسندی، تملق، تقدیر پسندی، توہم پرستی، تکبر، دوسروں میں ایک خاص طرح کا ہیچ مقداری کا جذبہ۔ ان سب برائیوں کو مستقل کر دیا۔ ان کو جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم ترقی کر کے اس مقام تک نہ پہنچ سکی جس کے بعد قومیت اور قومی تہذیب کے خدوخال صحیح طریقے سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک مشکل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے تو جو ہم کو ورثے میں ملا وہ پوری طرح تشکیل شدہ اور تراشیدہ اور بالغ قومیت نہیں تھی پوری طرح سے پختہ اور مخصوص تہذیب نہیں تھی، بلکہ اس کی بجائے جو ہم کو ملا وہ قومیت کے لئے RAW MATERIAL تھا۔ خام مسالہ تھا اور اسی طرح قومی تہذیب کے بھی بکھرے ہوئے اجزا تھے اور اس کا بھی خام مسالہ تھا اور اس کو تشکیل کرنے کا کام اور اس کی ذمہ داری ہم پر ڈال دی گئی جو کہ اس وقت بھی ہماری ذمہ داری ہے جسے ہمیں کسی نہ کسی طریقے سے سرانجام دینا ہے۔ اب یہ مشکل آپ ذہن میں رکھیے اور پھر یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کیجیے کہ ہم ان خصائص کا جو میں نے قومی تہذیب کے بیان کیے ہیں، اپنے آپ پر کیسے اطلاق کرتے ہیں۔

پہلی بات تاریخ کی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کہاں سے شروع کریں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہماری عمر ۲۹ برس ہے اور تاریخی اعتبار سے ہماری سرزمین کی عمر پانچ ہزار برس ہے اب یا تو ہم اپنی تاریخ ۵۰۰۰ برس سے شروع کریں یعنی موہنجوڈارو سے۔ اب تک جتنا زمانہ گزرا ہے، وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ ہمارے خطے کی تاریخ وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے

چند قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اگر آپ موہنجوداڑو کو اپناتے ہیں تو موہنجوداڑو کے بعد جتنے دور گذرے ہیں وہ سب آپ کو اپنی تاریخ کا حصہ ماننے پڑیں گے۔ ان ادوار میں برہمن تہذیب کا دور بھی ہے، بدھ تہذیب کا دور بھی ہے، یونانی تہذیب کا دور بھی ہے۔ اگر ان تمام تاریخی ادوار کو آپ اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کا جزو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اس زمانے کے جو بڑے بڑے ہیرو ہو گذرے ہیں، مفکر گذرے ہیں، فنکار ہوئے ہیں، ان کو بھی اپنے تہذیبی مورثوں میں شمار کرنا پڑے گا۔ مثلاً اشوک، چندر گپت، سکندر اعظم، پورس، راجہ رسالو وغیرہ۔ اگر آپ ہیرو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اپنے سیاسی نظریات میں تھوڑی بہت ترمیم بھی کرنا پڑے گی، کیونکہ تاریخ کا یہ جزو آپ کا ہندوستان کے ساتھ اور موجودہ بھارت کے ساتھ مشترک ہے اور پھر یہ غلط فہمی پیدا ہونے کی گنجائش ہے کہ اصل میں تو تاریخ کا تھوڑا سا حصہ ہی مختلف ہے، باقی تاریخ وہی ہے جو ان کی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ یہ نہیں کرتے، آپ اس قباحت سے نبٹنے کے لئے دوسری صورت اختیار کرتے ہیں اور اپنی تاریخ درودِ اسلام سے شروع کرتے ہیں۔ محمد بن قاسم سے یعنی بجائے پانچ ہزار سال قبل مسیح سے شروع کرنے سے آٹھ سو سال بعد مسیح اپنی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ اس میں بھی مختلف قسم کی الجھنیں ہیں۔ بڑی الجھن تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مسلمان باہر سے اس خطے میں آئے، وہ ایک تہذیب سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا تعلق مختلف تہذیبوں سے تھا۔ پہلے عرب آئے، پھر محمود غزنوی کے ساتھ غزنہ اور ہرات کے ترک غلام آئے اور تغلق، خلجی، غوری پٹھان آئے اور مغل آئے۔ بیچ میں ایرانی بھی آئے۔

اب یہ جتنی تہذیبیں ہیں، ان کی اپنی اپنی تاریخ ہے۔ یعنی اگر آپ عربوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں، تو ان کی تاریخ امرا القیس اور متنبی تک پہنچتی ہے۔ اگر آپ غوریوں سے، تغلقوں اور خلجیوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں، تو ان کی تاریخ چنگیز خاں وغیرہ سے ملتی ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم ان تہذیبوں میں سے جو کہ ایک تہذیب نہیں تھی (اگرچہ دین ان سب کا ایک تھا) کس قومی تہذیب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں تو ظاہر ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے تو وہ سب برابر ہیں اور ان کی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ بڑی تہذیبیں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی تاریخ اسلام سے شروع کرتی ہے

ان میں جتنی بھی مسلمان قومیں ہیں، جن میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں وارد ہوئیں۔ ان میں سب ہی اپنی تہذیب کو تاریخِ اسلام سے پہلے سے شروع کرتے ہیں جو زیادہ ORTHODOX اور زیادہ دیندار لوگ ہیں، وہ تو حضرت آدمؑ سے شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے جس کی نظر جہاں تک بعض کی یقطان اور قحطان تک پہنچی کسی کی ملکہ سبا تک پہنچی۔ بہرصورت وہ جسے اپنی تاریخ کا عمدہ دور سمجھتے ہیں، وہ دورِ سیستان اور حیلہ کی بادشاہتوں کا امرالقیس اور متنبی کی شاعری کا زمانہ ہے جو کہ اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اسی طرح ایرانی ہیں جو کہ اپنی تاریخ درفشِ کاویانی سے شروع کرتے ہیں۔ عراقی ہیں تو بابل کی تہذیب سے اپنا سلسلہ ملاتے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو کہ اپنی تہذیبی تاریخ ورودِ اسلام کی بجائے اپنے تاریخی ماخذ اور اپنے ابتدائی زمانہ سے شروع نہ کرے، تو اس لئے اگر ہم ورودِ اسلام سے شروع کریں۔ تو دینی طور پر تو ہم اس کا جواز پیش کر سکتے ہیں، لیکن تہذیبی طور پر یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت سی چیزیں ہیں جن کا کوئی تعلق عرب سے نہیں ہے نہ کوئی تعلق اسلام سے ہے۔

چنانچہ دو مشکلیں ہیں اگر آپ پاکستانیت پر زور دیں یعنی خطۂ زمین کی تاریخ پر زور تو پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان سے مل جاتی ہیں اور اس صورت میں آپ کی تہذیب میں اسلام کا عنصر دب جاتا ہے۔ اگر اسلامیت کو واحد بنیاد قرار دیں تو پھر پاکستانیت کا عنصر دب جاتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی تہذیب اگر محض اسلامی تہذیب ہے، تو پھر ایرانی، تورانی، سوڈانی اور انڈونیشیا والوں سے کس طرح مختلف ہے! اس مشکل کو تو یہاں چھوڑیئے اور آگے چلیے۔ دوسرا پہلو لیجیے یعنی جغرافیائی پہلو۔ ہماری تہذیب کی حدود کیا ہیں، کیونکہ یہ مشکل جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس کی طرف ہم بعد میں لوٹ آئیں گے۔

جغرافیائی اعتبار سے ہماری تہذیب کا مرکز کیا ہے اور اس کے دائرے کے حدود کیا ہیں؟ یہاں بھی اس قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں یعنی اگر آپ شروع سے اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں یعنی اس خطے کی تاریخ پر جسے ہم پاکستان کہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں کئی طرح کی تہذیبیں نمودار ہوئیں، کئی طرح کی تہذیبوں نے فروغ پایا۔ سب سے پہلے جسے آپ یہاں

کی خالص تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ جس کا یہیں پہ نشو و نما ہوا اور ولادت بھی یہیں ہوئی، تو وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے یا موہنجوڈارو کی تہذیب ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس تہذیب کی ولادت یہیں ہوئی، لیکن اس کے حدود پاکستان کے حدود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ تہذیب جنوب میں خلیج کمبے تک جو کہ ہندوستان کا حصّہ ہے اور مغرب میں سارے راجپوتانے تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے حدود وہ حدود نہیں تھے جو کہ موجودہ پاکستانی سندھ کے حدود ہیں یہ وہ تہذیب تھی جسے اس خطّے کی پہلی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اس کے کوئی ایک ہزار سال بعد آریہ یہاں وارد ہوئے اور آریائی تہذیب پیدا ہوئی۔ اس آریائی تہذیب کا مرکز یہاں نہیں تھا نہ اس کی ولادت یہاں ہوئی۔ اس کا مرکز وادیٔ گنگ و جمن میں تھا اور وہاں جب راجپوتوں کی بادشاہیاں قائم ہوئیں اور بڑے بڑے تہذیبی مرکز قائم ہوئے تو یہ اُدھر سے اِدھر آئی اور اپنے چھوٹے مرکز اس علاقے میں قائم کیے جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے بہت سی چیزیں پیدا کیں اور یہ تہذیب اپنی پیش رو تہذیب پر غالب آگئی۔ اس کے بعد تیسری تہذیب یعنی بدھ تہذیب پیدا ہوئی، بلکہ بدھ سے پہلے پانچسو سال قبل مسیح ایرانی تہذیب یہاں پہ آئی اور دوسو برس تک یہاں مسلط رہی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی صنعتیں اور فنون لائے۔ رسم الخط لائے۔ یہاں پہ سکہ بھی لائے اور یہ سب چیزیں یہاں کی مقامی تہذیب میں شامل ہوگئیں۔ اس کے بعد تین سو قبل مسیح یونانی یہاں آئے وہ اپنے ساتھ اپنا لباس، اپنے فنکار، اپنی آرائش کا سامان لائے اور یہ بھی یہاں کی تہذیب میں شامل ہو گئے۔ پھر کوئی دوسو سال قبل مسیح بدھ تہذیب کا عروج ہوا۔ اس زمانے میں چین اور وسطِ ایشیا کی جانب سے کُشن یہاں پہ آئے اور گندھارا تہذیب پیدا ہوئی۔ اس گندھارا تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ اس خطۂ زمین نے رومن تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑا اور بہت سے رومی اثرات یہاں پہ پیدا ہوئے۔ پھر ایک مختصر زمانہ ایرانیوں کا آیا جو سفید ہن آئے جنہوں نے اس تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد بدھ مذہب کا زوال ہوا اور پھر ہندو ریاستیں مثلاً راجپوتانہ کی ریاستیں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد اسلام کا ورود ہوا جو مختلف ممالک کے مسلمان یہاں پہ آتے رہے۔ اب ان تہذیبوں میں سے کوئی سی ایک تہذیب

بھی ایسی نہیں جسے ہم کہہ سکیں کہ پاکستان کی موجودہ حدود کے اندر قید تھی یا جسے ہم کلیتہً اپنی تہذیب کہہ سکیں۔ اب آخری دَور لیجئے، جس میں کہ ہماری تہذیب پیدا ہوئی یعنی ہندی مسلمانوں کی، تو اس میں بھی کسی فن کو لے لیجئے۔ ہندوستان کی موسیقی جو مسلمانوں نے ایجاد کی۔ اس کے موجد سلطان حسن شرقی اور امیر خسروؒ اور تان سین بھی پاکستان سے باہر ہیں۔ فنِ تعمیر لے لیجئے۔ ان کے بڑے مراکز مثلاً تاج محل، لال قلعہ وغیرہ بھی پاکستان سے باہر ہیں۔

کیا ہم اس فن کو پاکستانی کہیں جو پاکستان میں پیدا ہوا؟ اگر ہم یوں کریں تو پھر تاج محل، لال قلعہ اور غالب، میر، امیر خسرو تان سین ان سب کو اپنی تہذیب سے خارج کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ان سب کو اپنی تہذیب میں شامل کرتے ہیں تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری تہذیب پاکستان کی حدود میں محدود نہیں ہے یا نہیں تھی یعنی اس کی حدود موجودہ سے متجاوز ہیں، یہ دوسری مشکل ہے۔ اس مشکل کو بھی یہاں چھوڑیئے۔

تیسری طرف چلئے جسے میں نے گہرائی کہا تھا۔ کسی کلچر یا تہذیب کی کسی معاشرہ یا کسی سماج میں رسائی کہاں تک ہے اور کن طبقوں تک وہ پہنچتی ہے؟ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھیئے، تو پھر بھی کافی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔ سب سے بڑی پیچیدگی تو یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں موہنجوڈارو کو چھوڑ کر یہاں ہمیشہ دو تہذیبیں ہر دَور میں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ ایک وہ تہذیب جس کو کہ آپ کلاسیکی تہذیب کہہ لیجئے یا درباری تہذیب یا اُمرا کی تہذیب یا انگریزی زبان میں جس کو METROPOLITAN یا مرکزی تہذیب کہتے ہیں۔ یعنی جو بھی بادشاہتیں یہاں پہ قائم ہوئیں۔ ان میں جو اُمراء تھے، جو درباری تھے اور جو ان درباریوں کا طبقہ تھا، ان سب کی ایک تہذیب ہوتی تھی۔ ان کی ایک زبان ہوتی تھی۔ ان کا خاص قسم کا لباس ہوتا تھا۔ خاص اخلاق ہوتے تھے، آداب ہوتے تھے، ان کی ایک خاص تہذیب تھی جو کہ اوپر کے طبقے کی تہذیب تھی۔ اب اس تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبیں تھیں جو کہ عوامی یا FOLK تہذیبیں تھیں وہ مقامی تھیں۔ بلوچ الگ۔ سندھی الگ، پنجابی الگ، پٹھان الگ اور بنگالی الگ۔ چنانچہ ایک اختلاف درباری اور عوامی تہذیب میں تھا۔ دوسرے اختلاف بھی تھے۔ مختلف مقامی عوامی تہذیبوں میں یعنی جو پنجابیوں کی تہذیب تھی اس کی اپنی تاریخ تھی، اپنے خصائص تھے جو کہ سندھیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں سے مختلف تھے۔ چنانچہ ہماری تہذیبی روایت میں دو طرح کی

تفریقات تھیں۔ ایک درباری اور عوامی تہذیب کی تفریق اور دوسرے عوامی، مقامی یا علاقائی تفریق۔ چنانچہ اس میں سے کسی ایک تہذیب کو ہم پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ نہ پنجابی، نہ بلوچی، نہ پشتو، نہ بنگالی کو کیونکہ یہ مقامی ہیں اور دوسری جو درباری تہذیبیں تھیں۔ ان میں سے بھی کسی ایک کو ہم اپنی پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ یہ تہذیب ہر دور میں مختلف ہوتی رہی ہے اور اب ان سب پر مستزاد ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی جو کہ انگریز یہاں لائے۔ جب انگریز یہاں پہنچے، تو انہوں نے اپنے انتظامی امور کے لئے اپنی حکومت چلانے کے لئے یہاں کے نظام میں ترمیم کی اور اپنا ایک افسر شاہی یا نوکر شاہی نظام پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا۔ ان طبقوں کے علاوہ جو یہاں پہلے موجود تھے۔ ایک اُمرا کا طبقہ تھا جس کی تہذیب موجود تھی۔ دیہاتی عوام کی مختلف تہذیبیں موجود تھیں۔ اب اس پر ایک نئے طبقے کا اضافہ ہوا جو ہم لوگ ہیں یعنی شہر کا سفید پوش طبقہ جو کہ پہلے موجود نہیں تھا۔ اب اس طبقے کے ساتھ کیا ہوا، کیونکہ یہ اُمرا میں شامل نہیں تھے اس لئے اس تہذیب کا حصہ نہیں تھے نہ یہ دیہات کے عوام میں شامل تھے کیونکہ اس کی تہذیب سے بھی کٹ گئے تھے۔ چنانچہ یہ جو ہمارا طبقہ پیدا ہوا۔ اس کو نہ اس تہذیب سے تعلق تھا نہ اس تہذیب سے اور ان بیچاروں کو لازماً مغربی تہذیب کا سہارا لینا پڑا اور انہوں نے کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تہذیب کی نقالی کریں۔ اسی طرح کا لباس پہنیں، اسی طرح کے گھر بنائیں اور اسی طرح کے رسم و رواج اور آداب و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ ایک تیسری چیز پیدا ہوئی۔ اس وقت جو ہمارے معاشرے کا تہذیبی ڈھانچہ ہے اس میں یہ سب چیزیں شامل ہیں، اس میں آپ کی پرانی درباری تہذیب بھی شامل ہے۔ اس میں مختلف عوامی تہذیبیں بھی شامل ہیں اور اس میں ایک سفید پوش طبقہ کی نیم مغربی نیم مشرقی تہذیب بھی شامل ہے۔ اب یہ صورت حال ہے اور یہ مسائل ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان سے نپٹنا کیسے جائے؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ پاکستانی تہذیب کو ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف باقی اسلامی ممالک سے ممیّز کیسے کریں؟ یعنی اس تہذیب کو جس کو آپ پاکستانی تہذیب کہتے ہیں۔ اس کی شخصیت IDENTITY اور اس کی انفرادیت کا کیسے تعیّن کریں؟ اس پر ذاتی

رائے تو دی جا سکتی ہے لیکن اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں یعنی ایک طرف ہماری وطنیت اور دوسری طرف ہمارا دین۔ اس لئے ہماری تاریخ ۵ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں، لیکن اس میں ایک حصّہ ایسا ہے جو کہ ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں ہے یا ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مشترک نہیں ہے۔ وہ ایک ہزار سال کا حصّہ ہے جو کہ اسلامی دَور کا حصّہ ہے اور اس دور کی جو تہذیبی روایات ہیں اس کا فن، اس کے عقائد، اس کے رہنے سہنے کے طریقے، اس کے رسم و رواج وہ غیر مسلموں کے اور ہندوستانیوں کی تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیّز کرتی ہے۔ دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے۔ یہ ہم میں اور باقی اسلامی ممالک میں مشترک نہیں ہے۔ ایک ہزار سال کی اسلامی روایات دوسرے اسلامی ممالک سے مشترک ہیں، لیکن چار ہزار سال کی ہماری مقامی روایات ہیں اور پاکستانی روایات ہیں یعنی وطنی روایات جو کسی دوسرے اسلامی ملک کے ساتھ مشترک نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارا وطن ہم کو باقی اسلامی ممالک سے الگ کرتا ہے اور ہمارے دین کی روایات ہم کو غیر مسلم ہمسائیوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مل کے ایک خصوصی چیز پیدا ہوتی ہے۔ ایک انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاکستان کی تہذیبی شخصیت کہتے ہیں۔ یہ تو رہی پہلی بات۔

دوسری بات حدود کی ہے۔ اس کا بھی میرا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز اور اچھی چیز جو کہ ہمارے اس چار ہزار سال کی پیداوار ہے، وہ بھی ہماری ہے اور ہر وہ چیز جو پچھلے ایک ہزار سال کی روائتوں کا نتیجہ ہے، خواہ اس کا جغرافیائی مرکز کہیں ہے وہ بھی ہماری تہذیب کا حصّہ ہے چنانچہ حافظؔ اور خیامؔ بھی ہماری تہذیب کا حصّہ ہیں۔ اس لئے کہ وہ اسلامی روایات سے تعلّق رکھتے ہیں اس وجہ سے غرناطہ ہماری تہذیب کا حصّہ ہے، کیونکہ وہ اسلامی تہذیب سے متعلّق ہیں۔ اس وجہ سے کاشی کاری اور وسط ایشیا کے دوسرے فنون بھی ہماری تہذیب سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق بھی براہ راست اسلام کی تہذیبی روایت سے ہے۔ اسی وجہ سے تاج محل، لال قلعہ،

غالب ۔ میر ۔ تان سین ، خسرو اور شرقی وسدا رنگ یہ سب ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہیں اگرچہ جغرافیائی طور پر ان کو پاکستانی حدود میں مقید نہیں کر سکتے اور یہی ایک صورت ہے جس میں کہ آپ اپنی تہذیب کو ایک طرف بہت محدود ہونے سے بچا سکتے ہیں اور دوسری طرف بہت ہی CONFUSED اور پراگندہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

تیسرا سوال رہا آپ کے معاشرتی مسائل کا کہ ہمارے ہاں جو مختلف علاقائی تہذیبیں رائج ہیں پنجابی ، سندھی ، بلوچی ، پشتو اور بنگالی ۔ ان کو یکجا کر کے ہم قومی تہذیب کیسے بنا سکتے ہیں ۔ ایک مسئلہ ۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ دو سو برس ہم نے جو غلامی میں گذارے ہیں جس کی وجہ سے ہماری تہذیبی سطح دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت بہت نیچے رہ گئی ہے اس کمی کو کیسے پورا کرنا ہے اور اپنی تہذیب کو اس سطح تک کیسے پہنچانا ہے کہ ہم دنیا کے سب سے مہذب ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں ۔ یہ رہا دوسرا مسئلہ تیسرا مسئلہ یہ کہ ہم اپنے معاشرتی نظام کو کس طریقے سے تشکیل دیں یا کس طریقہ سے تشکیل دینا چاہیئے تاکہ پرانا فرق جو اُمرا اور عوام کی تہذیبوں میں تھا ، وہ دُور کیا جا سکے اور یہاں پر جو بھی تہذیب ہم تشکیل کریں ، اس میں سب عوام کو یکساں حصہ ملے ۔ چنانچہ یہ تین طرح کی ذمہ داریاں تین طرح کے کام اور تین طرح کے مسائل ہیں جن سے ہمیں نبٹنا ہے ۔

پہلا مسئلہ ارتباط کا ہے یعنی ہمارے ہاں جو مختلف علاقے ہیں یا مختلف تہذیبیں ہیں ، ان کا ارتباط کیسے کرنا ہے اور ان میں اتحاد کیسے پیدا کریں ۔ یہ رہا پہلا مسئلہ جو کہ مستقبل میں ہمیں حل کرنا ہے ۔

دوسرا مسئلہ ارتفاع کا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کی سطح کو بلند کیسے کریں ؟ اور اس کی پسماندگی کو دُور کیسے کریں ؟

تیسرا مسئلہ انضباط کا ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کی تشکیل کس طرح کرنی ہے تاکہ ہمارے معاشرتی انضباط کے ساتھ ہماری تہذیبی زندگی میں ایک وسعت اور ملک گیری پیدا ہو ۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کل بات کریں گے ۔

سوال : غالباً سوال کیا گیا تھا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہیں ؟ ۔

جواب : جس ملک میں اسلام پہنچا اسلام کی وجہ سے وہاں چند ایک باتیں ، چند ایک خوبیاں یا اوصاف

پیدا ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں مقامی تہذیب تباہ نہیں ہوئی، بلکہ اس کی ترمیم ہوئی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جتنے اسلامی ممالک ہیں، ان کی اپنی اپنی تہذیب الگ ہے۔ اگرچہ ان میں اسلامی خصائص مشترک ہیں۔ چنانچہ ہم اپنی تہذیب کو ایرانی تہذیب اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ہماری زبان ایرانیوں کی سی نہیں ہے۔ ہماری مصوری، ہمارے ادب کا ایرانیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف چند ایک چیزیں مشترک ہیں۔ چنانچہ ہم کُلی طور پر کسی ایک قوم کی تہذیب کو کسی دوسری قوم کی تہذیب کے ساتھ منطبق نہیں کر سکتے۔ خواہ ان کا دین اور بہت سی خصائص مشترک ہوں۔ اس وجہ سے یا تو ہم پاکستانی کو پاکستانی نہ کہیں اور اگر پاکستانی کو پاکستانی کہتے ہیں اور اگر ہم پاکستانی قومیت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ اس قومیت کے لیے آپ کو ایک الگ تہذیب بھی وضع کرنی پڑے گی وہ اگر موجود نہیں ہے۔ اور اگر موجود ہے تو اس کو اپنانا پڑے گا۔ پاکستان تو اسلام نہیں ہے۔ پاکستان تو جغرافیہ ہے۔ ملک کا نام ہے، دین کا نام نہیں ہے اگر آپ اپنے کو پاکستانی نہ کہیں اور اپنی قومیت سے انکار کر دیں تو پھر یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ قومیت پر مُصر ہیں تو پھر آپ کو قومی تہذیب پر بھی مُصر ہونا پڑے گا پھر آپ اس قومی تہذیب کو کسی دوسری قومی تہذیب کا حصہ نہیں سمجھ سکتے۔

سوال: غالباً یہ سوال کیا گیا تھا کہ اگر ہم اپنی تہذیب کو پاکستانی تہذیب کہیں، تو کیا یہ اسلام سے بُعد کا باعث نہ ہوگا؟۔

جواب: کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے ساتھ کوئی قومی تہذیب مطابقت نہ رکھے جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ دین یا مذہب آپ کے عقائد اور اخلاق اور ایک حد تک آپ کے آداب کی تشکیل کرتا ہے۔ دین آپ کی زبان، لباس، خوراک اور رہن سہن کے طریقے متعین نہیں کرتا اور خاص طور پر دینِ اسلام سوائے حلال و حرام کے کسی خوراک کی وضاحت نہیں کرتا کہ چاول کھائیں یا روٹی کھائیں یا کس قسم کے ظروف استعمال کریں یا آپ کے ادب کی کیا صورت ہوگی؟ یا یہ کہ آپ کی تعمیر کی کیا صورت ہوگی تو میں نے جو تہذیب کی تعریف کی تھی۔ اس میں عرض کیا تھا کہ باطنی قدروں کے علاوہ اور علاوہ ان اخلاق کے جو براہِ راست دین سے متعلق ہیں، زندگی کا جملہ روزمرہ شامل ہوتا ہے اور وہ روزمرہ ہمیشہ حالات سے متعین ہوتا ہے جو مقامی تاریخی اور جغرافیائی حالات

کے علاوہ کسی اور طریقے سے متعین نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عام مغالطہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو قومی تہذیب بنایا جاسکتا ہے یا اس میں بند کیا جاسکتا۔

سوالات: (۱) تہذیبی جھنجھٹ کی گوناگونی سے بچنے کے لئے اسلامی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور اسی پر پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ کیا اس بات میں حقیقت نہیں ہے؟ یا پاکستانی تہذیب ناقابلِ عمل ہے؟

(۲) ؎ تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک شاخسار ایم

تہذیب کو اس رنگ میں پیش کریں جس میں علامہ اقبالؔ نے پیش کیا ہے؟۔

جواب: مَیں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اسلام، اسلامی تہذیب اور قومی تہذیب میں کوئی فرق یا تضاد نہیں ہے۔ ہر قومی تہذیب اسلامی تہذیب ہے بشرطیکہ اس کے اخلاق و عقائد وہی ہوں جن کی کہ مذہب اسلام تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ جب سے اسلام پیدا ہوا ہے، بیسیوں اسلامی ملک، ایران، توران، سوڈان اور مصر وغیرہ سارے ملکوں کی تہذیب اسلامی ہے لیکن اسلامی تہذیب کے علاوہ ہر ملک کی اپنی تہذیب بھی ہے ان کی قومی اور اسلامی تہذیب سے مل کے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے، اس کو ہم مجموعی طور پر ان کی تہذیبی خصوصیت گردانتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح پاکستانی تہذیب اپنے مقامی فنون، رسوم، رہن سہن، اپنے ادب زبان اور مقامی اجزا کو اپناتی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنے عقائد اور اپنے اخلاق اسلامی رکھیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان باقی اجزا کو آپ قومی کیوں نہ سمجھیں یا ان کو قومی کیوں نہ قرار دیں اور اس طریقے سے جو پاکستانی تہذیب بنے گی یا موجود ہے وہ پاکستانی بھی ہے اور اسلامی بھی ہے اگر ہم اپنی قومیت کو مانتے ہیں (اور اگر اس سے انکار ہے، تو دوسری بات ہے) تو لازماً ہماری تہذیب کے دو عناصر ہوں گے: ایک اسلام اور ایک پاکستانیت میں جس چیز کی وضاحت کر رہا تھا وہ پاکستانیت کا عنصر تھا، اس لئے کہ اسلام کے بارے میں نہ کسی بحث کی ضرورت ہی ہے اور نہ ہی وضاحت۔ وضاحت جس چیز کے

کرنے کی تھی وہ قومی اور مقامی خصوصیات ہیں کہ پاکستانیت سے کیا مراد ہے۔ جب علامہ اقبالؔ نے یہ کہا تھا کہ ؎

ما پروردۂ یک شاخسار ایم

اور اس لئے رنگ و بُو کی ہمیں تمیز نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اسلامی ممالک اپنی تہذیب سے روکش ہو جائیں یا اپنی تہذیب کو بھول جائیں یا سب کے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ان کی مراد بھی یہی تھی کہ جو ہمارے عقائد، اخلاق اور روائتیں یکساں ہیں، ان میں ایک دوسرے میں تمیز نہ کریں اور ان کی بنیاد پہ عالم اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں، لیکن اقبالؔ کی مُراد یہ نہیں تھی کہ ایرانی عرب ہو جائیں یا ترک ہو جائیں۔ یہ اتحاد تو دینی و ملّی اتحاد تھا۔ یہ میرے نزدیک قومی تہذیبوں کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر آپ اس کی نفی کریں گے تو لازماً اس کی قسم کے جھگڑے پیدا ہوں گے جیسے کہ پُرانے زمانے میں عربوں اور ترکوں میں پیدا ہوئے۔ جب تک عربوں میں اسلامی جذبہ قائم رہا اس وقت تک عالم اسلام نے انہیں مانا، لیکن اس کے بعد جیسے کہ آپ جانتے ہیں ترکوں نے بغاوت کی، کبھی ایرانیوں نے بغاوت کی، کیونکہ کوئی قوم بھی اپنے قومی خصائص کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب کریں گے یا مسلّط کریں گے تو بجائے اس کے کہ اس سے اتحاد پیدا ہو، اس سے لازماً افتراق پیدا ہوگا۔ اتحاد اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کو داخلی طور پر اپنی زندگی، اپنے مزاج اور روائتوں کے مطابق بسر کرنے کی آزادی ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ جو چیزیں اور رشتے دینِ اسلام کی وجہ سے دوسرے ممالک کے ساتھ ہیں، ان رشتوں کو استوار کر کے آپس میں اتحاد کریں۔

سوال، اگر زبان کا تعلّق تہذیب سے ہے تو اردو زبان کا تعلق پاکستان سے کب ہے، جب یہ دکن سے چلی اور دلّی آئی؟۔

جواب: یہ سوال اس لئے ضروری ہے کہ زبان کا مسئلہ ہمارے ہاں بہت اہم ہے چنانچہ اس کے بارے میں چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو زبان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ پیدا کہاں ہوئی

لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ زبان پہلے وہیں پیدا ہوئی ہو گی جہاں مسلمان پہلے وارد ہوئے ہوں گے اور جہاں پہلے ترکی، فارسی اور عربی زبانوں کا مقامی زبانوں سے اختلاط ہوا ہو گا اور وہ علاقہ تو یہی علاقہ ہے جو پاکستان کا ہے۔ چنانچہ آپ نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے بارے میں سُنا ہو گا جنہوں نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہ کہا کہ "اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور دکن میں بعد میں پہنچی"۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو زبان ہماری تہذیب کا حصّہ نہیں ہے۔ اگر یہ نظریہ قابلِ قبول نہ ہو، تو یہ ظاہر ہے کہ اگر درباری زبان فارسی تھی خاص طور پر مغلیہ زمانے میں تو اُمرا اور عام بول چال کی زبان اردو تھی یا اردو کی ایک صورت تھی اور اس مغلیہ تہذیب اور سلطنت میں اس علاقہ کو جسے ہم پاکستان کہتے ہیں، بہت اہمیّت حاصل تھی۔ یہاں دَو سو برس پہلے اردو کے بہت سے ادیب پیدا ہوئے جن کی تحریریں کچھ دستیاب ہوتی ہیں اور کچھ دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ چونکہ دربار دلّی میں تھا اس لئے زیادہ نامور ادیب اور شعرا دلّی میں پیدا ہوئے، لیکن درباری شعرا اور ادیبوں کے علاوہ صوفیا، علما، مورّخوں، فقیہوں اور مبلّغوں نے جو دینی اور دنیوی کتابیں گمنامی میں رہ کر لکھیں وہ اردو میں تھیں اور یہ سب لوگ اسی خطّے میں پیدا ہوئے اور اسی خطّے میں انہوں نے زبان کو فروغ دیا۔ اس کے بعد جب انگریز آئے، تو اردو کو اس کے اپنے وطن میں زوال ہوا۔ اردو زبان کا صحیح فروغ اور ترقّی اسی علاقہ میں ہوئی جس کو ہم آج پاکستان کہتے ہیں۔ اس لئے اردو زبان ہماری تہذیبی روایت سے الگ چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا اہم جزو ہے۔

اگرچہ اس زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مقامی زبانیں بھی ہیں اور ان زبانوں کی اپنی تاریخ ہے، ان کا اپنا ادب ہے اور ان کی اپنی تہذیبی اہمیّت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اردو اور مقامی زبانوں میں اس قسم کا ارتباط پیدا کریں اور ایسا رشتہ پیدا کریں کہ یہ زبانیں بھی اور اردو بھی ہمارے ہاں فروغ پا سکیں۔

سوال: غالباً یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا مختلف ثقافتی نمائشیں جو آجکل وقتاً فوقتاً کی جاری ہیں، ہماری اسلامی تہذیب کا حصّہ ہیں؟"

جواب: مَیں سمجھتا ہوں کہ فن اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی۔ اور اگر کوئی فن پاکیزہ ہے

تو اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اچھے فن کار بھی ہیں جو کہ اسلامی تہذیب یا ہماری تہذیب کے مطابق ہیں۔ کچھ بُرے، لوچ پوچ اور لچر فنکار بھی ہیں جن کا عمل اسلام سے صریحاً متصادم ہے۔ مثلاً موسیقی کو لے لیجئے، اسلامی تاریخ کے ہر دَور میں چاہے وہ اُمیّہ یا عبّاسی ہوں ہمیں موسیقی کے سرپرست ملتے ہیں۔ اسحاق موصلی اور خلیفہ مقتضی باللہ اور ایسے کئی بڑے بڑے نام ہیں جو اسلامی روایت کا حصّہ ہیں، لیکن اس زمانے میں گھٹیا اور فحش موسیقار بھی ہوں گے جن کا نام آج ہم نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ ہماری تہذیب کا حصّہ نہیں ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں جو فن پاکیزہ، شائستہ اور بلند اخلاق کی طرف ترغیب دینے والا ہے، وہ اسلامی ہے۔ جو فن فحش ہے اور جس سے لوگوں کا اخلاق بگڑتا ہے، وہ اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔

تیسری تقریر

پاکستانی تہذیب کا مستقبل

پیشتر اس کے کہ میں اپنے موضوع کے اس حصّے پر بات کروں جو آج کے لئے مخصوص کر رکھا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو سوال جو کل اٹھائے گئے تھے اور جو بنیادی سوالات تھے، پہلے ان سے نپٹ لوں۔

کل جو ایک بہت دلچسپ سوال ہوا وہ یہ تھا کہ تہذیب کے جھنجھٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہم نے پاکستان بنایا تھا اور اب اس میں دوبارہ پھنسنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کیا یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ پاکستان کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے۔؟

اس سوال کا پہلا حصّہ کہ تہذیب کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پانے کے لئے پاکستان بنایا تھا اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اصل میں اس جھنجھٹ سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ اس میں پھنسنے کے لئے پاکستان بنایا تھا۔ وہ یوں کہ آپ کو یاد ہے پاکستان کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ چونکہ ہم ایک الگ قوم ہیں، اس لئے ہمیں اپنا الگ وطن چاہیئے اور ہم الگ قوم اس لئے ہیں کہ ہماری تہذیب الگ ہے۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں پوچھا جو کہ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے تھا اور آج ہم اپنے آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہماری تہذیب الگ ہے، وہ تہذیب کیا چیز ہے۔؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ہماری تہذیب اسلامی تہذیب ہے۔ میں دو دن سے یہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے کافی نہیں ہے کہ تہذیب یا کلچر جیسے میں نے عرض کیا تھا کوئی نظریاتی یا THEORETICAL چیز نہیں ہے۔ وہ تو ایک واقعاتی FACTUAL چیز ہے جو کہ مختلف اوقات میں اور مختلف معاشروں اور مختلف صورتوں میں پیدا ہوتی ہے۔ جس کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں آپ اس پر غور کریں کہ اس میں کون سے اجزاء شامل ہیں اور وہ کیا چیز ہے جس کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ اگر آپ تاریخی کتابوں یا ایسی کتابوں کو جن میں اسلامی تہذیب کا ذکر

ہے ملاحظہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک تہذیب نہیں ہے جس کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں، بلکہ یہ بہت سی تہذیبیں ہیں جن کو ہم اجتماعی طور پر اسلامی تہذیب کہتے ہیں، کیونکہ ان میں قدر مشترک دین اسلام ہے۔ مثال کے طور پر ہسپانیہ میں اموی تہذیب پیدا ہوئی اور مصر میں فاطمی تہذیب پیدا ہوئی۔ ایران میں صفوی تہذیب نے سر اٹھایا، ہندوستان میں مغلی تہذیب نے۔ اور ان تہذیبوں کے عناصر پر اگر آپ غور کریں تو اس میں غرناطہ اور قرطبہ کے محلات بھی شامل ہیں، اس میں ابا صوفیہ اور محمد علی کی مساجد بھی شامل ہیں، ابو اسحاق امیر خسرو اور تان سین کی موسیقی بھی شامل ہے۔ بہزاد اور منصور کی تصویریں بھی شامل ہیں، اس میں ایران کی قالین بافی بھی شامل ہے، ڈھاکہ کی ململ بھی، اس میں شلوار، قمیض، تہبند، جلباب، قماشہ، عبا اور عمامہ تمام چیزیں شامل ہیں، لیکن یہ چیزیں کسی ایک تہذیب کا حصہ نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ جہاں جہاں دین اسلام پہنچا وہاں پر جو مقامی تہذیب رائج تھی اس سے مرکب ہو کے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ جو کہ اس علاقہ، ملک اور قوم کی تہذیب قرار پائی اور یہ ساری تہذیبیں مختلف بادشاہوں اور مختلف شہنشاہوں کے زمانے میں پیدا ہوئیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس وقت طویل زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہم اس میں سے کسی ایک تہذیب کے حالات پیدا کر سکتے ہیں، نہ ہم ان میں سے کسی ایک تہذیب کا معاشرہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہم ان میں سے کسی ایک تہذیب کے پیچھے جو جذباتی اور احساساتی محرکات تھے وہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری تہذیب اسلامی تہذیب ہے تو ہمیں یہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ کون سی اسلامی تہذیب ہے۔ امویوں کی، عباسیوں کی، صفویوں کی یا مغلوں کی۔ کیونکہ اسلامی تہذیب کہہ دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہر ایک کی اور ہر زمانے میں مختلف اسلامی تہذیب رہی ہے اور ہماری جو اسلامی تہذیب ہوگی وہ پاکستانی اسلامی تہذیب ہوگی۔ وہ مصری، ایرانی یا ملائشی تہذیب نہیں ہوگی۔ وہ ہماری اپنی وطنی پاکستانی تہذیب ہوگی۔ اس وجہ سے ہمیں اس کی نوعیت، ماہیت اور اس کے صحیح خدوخال متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ یہ جو ہمارے ثقافتی شو ہوتے ہیں یا جو ہمارے ہاں ثقافت

رائج ہے کیا اس کو ہم اسلامی کہہ سکتے ہیں ؟ یا یہ اسلام کے مطابق ہے ؟ یا پاکستانی مزاج کے مطابق ہے۔ ؟

یہ بھی ایک بنیادی سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو ہم آجکل ثقافتی شو کہتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ بیشتر غیر اسلامی ہوتے ہیں بلکہ غیر ثقافتی بھی ہوتے ہیں۔ ان کا ثقافت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے میں نے رہن سہن کے آداب کے علاوہ اخلاق اور فنون کے ترقی یافتہ صورت کے اجزا گنوائے تھے۔ اس لئے اگر آپ ایسا ملغوبہ تیار کرلیں جس میں نہ ہمارے اخلاق کی نمائندگی ہو اور نہ ہی وہ فن کی ترقی یافتہ صورت ہو، تو وہ نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ غیر ثقافتی بھی ہے اور غیر تہذیبی بھی ہے۔ اسی لئے بہت سی تقریبیں جو ہم منعقد کرتے ہیں ان کو ہم تہذیبی یا ثقافتی تقریبیں نہیں کہہ سکتے۔ وہ محض ایک لفظ ہے جو ہم اس لئے استعمال کرتے ہیں تاکہ ایک گھٹیا چیز نسبتاً بڑھیا چیز نظر آئے، لیکن اس کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا سب موسیقی اور سب فنون غیر اسلامی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ آپ جب اسلامی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو اس تہذیب میں سوائے فنون کے اور کیا چیز ہے جس کا آپ ذکر کرتے ہیں۔ جس چیز پر آپ فخر کرتے ہیں وہ تاج محل ہے، مسجدِ قرطبہ ہے اور امیر خسرو ہے، حافظ یا خیام ہے۔ فرض کیجئے اگر ہم سے قبل سب لوگوں کا نقطۂ نظر یہی ہوتا اور جتنے معاشرے اب سے پہلے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ سب فنون غیر اسلامی ہیں اور ان کی طرف ہمیں توجہ نہیں دینا چاہیئے۔ تو پھر غور کیجئے کہ آج آپ کس چیز پر فخر کرتے ؟ اور کس چیز کو آپ اپنا تہذیبی ورثہ کہتے ؟ جو تہذیبی ورثہ آپ کو ملا ہے اس کی بہترین اور ترقی یافتہ صورت وہی ہے جو کہ اس زمانے کے مشہور فن کاروں نے تخلیق کی ہے اور وہ فن کار اپنے زمانے کے معاشرے کی بہترین قدروں، بہترین جذبات اور بہترین احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تہذیبی ورثہ نہ صرف عالمِ اسلام میں بلکہ ساری دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کو بھی غور کرنا چاہیئے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد یا پانچ سو سال بعد یا دو سو سال بعد جب آپ کے بعد کے آنے والے لوگ یہ سوچیں گے کہ یہ پاکستان جو ہم نے بنایا تھا، اس میں ہمارے تہذیبی ورثہ

میں کیا اضافہ ہوا۔ اگر وہ لوگ کسی چیز کے بارے میں فخر کریں گے تو وہ کیا چیز ہوگی جو کہ ہم پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ آپ لال قلعہ پر فخر کرتے ہیں کیونکہ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ اگر ہم اس وقت کچھ نہیں پیدا کریں گے ہم کچھ تخلیق نہیں کریں گے، تو بعد کے آنے والے لوگ کس بات پر فخر کریں گے۔؟

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی فن بجائے خود نہ اچھا ہوتا ہے اور نہ بُرا۔ اس فن میں اگر غیر اخلاقی، غیر مہذّب، لغو اور پوچ قسم کی چیزیں پیدا کریں تو وہ فن غیر اسلامی بھی ہے اور غیر تہذیبی بھی، اگر آپ کسی فن میں شائستہ، مہذّب اور اخلاق کو سنوارنے والی چیزیں پیدا کریں اور اس قسم کے جذبات کا اظہار کریں تو وہ فن اسلامی بھی ہے اور تہذیبی بھی۔ چنانچہ کسی فن کے بارے میں کہنا یہ لغو ہے اور کسی فن کے بارے میں کہنا کہ یہ بجائے خود اچھا ہے، اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس فن میں اظہار کس بات کا کیا جا رہا ہے۔ یا کیسے کیا جاتا ہے۔ اگر اخلاق اور شائستگی سے کیا جاتا ہے، تو اچھا ہے۔ اگر لغو اور غیر اخلاقی طور سے کیا جاتا ہے تو بُرا ہے، میں سمجھتا ہوں، یہی ہمارا روایتی تصوّر بھی ہے اور یہی ہمارا آج کل کا تصوّر بھی ہونا چاہیئے، اس کا خلاصہ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا روم نے یوں کہا ہے۔ جو یہی اس بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کا خلاصہ ہونا چاہیئے کہ ؎

ہر کہ باشد خوب و زیبا و جمیل

در بیابانِ طلب۔ مارا دلیل

کہ ہر وہ چیز۔ جو کہ پاکیزہ ہے، خوبصورت ہے اور شائستہ ہے۔ وہ تلاشِ حق میں منزل کے لئے دلیل ہے۔ جس دلیل کی وجہ سے آپ اس منزل کو پہچانتے ہیں اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو وہ سوالات تھے جو کل ہوتے۔

ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ تہذیبی مسائل جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، ان کے بارے میں ہم کو کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے اور ان کے بارے میں کس قسم کے امکانی حل ہمارے معاشرے میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

میں یہاں اپنی ایک دقّت بیان کرنا چاہتا ہوں اور معذرت کرتا ہوں کہ کسی مسئلہ کو

بیان کرنا اور اس کی تشخیص کرنا تو آسان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ جو چیز موجود ہے، اس کی تشخیص کرنا اور اس کو متعین کرنا آسان ہوتا ہے، لیکن کسی مسئلے کا حل تو موجود نہیں ہوتا وہ تو ایک خیالی اور نظریاتی چیز ہے، اس لئے اس کے بارے میں ہم اس تیقن سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے جس تیقن سے کسی مسئلے کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسئلہ چونکہ موجود ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت اور عدم صحت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن حل چونکہ مستقبل میں ہوتا ہے اس لئے آپ اس بارے میں قطعی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ صحت آزمائش اور تجربہ کے بعد ہی ثابت ہو سکتی ہے تیسری بات یہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ کے بعض اوقات ایک سے زیادہ حل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مرض اگر تشخیص ہو جائے تو وہ تشخیص اپنی جگہ مسلّمہ ہے۔ لیکن اس کا علاج آپ یونانی بھی کر سکتے ہیں، ہومیو پیتھک بھی کر سکتے ہیں، ایلوپیتھک بھی کر سکتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ آپ سارے نسخے آزمالیں، یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کون سا نسخہ ٹھیک بیٹھے گا۔ کبھی ایک ٹھیک بیٹھے گا کبھی دوسرا۔ چنانچہ آج جو میں باتیں کر رہا ہوں، ان کے بارے میں مجھے کسی قطعیت کا دعویٰ نہیں ہے۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے تہذیبی مسئلوں میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی یعنی پاکستانی تہذیب کی اساس کس چیز پہ رکھیں۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا یا میری رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کی اساس دو باتوں پر ہے۔ ایک ہماری پاکستانیت پر یعنی ہمارے وطن پر اور دوسری ہمارے دین پر یعنی اسلام پہ۔ اگر آپ یہ اساس مان لیں تو پھر ہماری پاکستانی تہذیب کا نقشہ یوں بنے گا کہ پاکستانی ہونے کے اعتبار سے اس وطن سے جو بھی پرانی تہذیبی روایتیں ابتدائے تاریخ سے لے کر اب تک ہیں، جو بھی پرانے آثار، جو بھی پرانے فنون اور پرانے آداب ہیں وہ سب ہمارے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ موہنجوڈارو اور ٹیکسلا بھی ہمارا ہے، گندھارا تہذیب بھی ہماری ہے اور اس کے بعد جتنی تہذیبیں آج تک آئی ہیں وہ سب ہماری ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جتنی اسلامی تہذیبیں پیدا ہوئی ہیں ان میں جتنی اچھی روایتیں ہیں، جتنے اچھے آثار ہیں، جتنے اچھے علوم و فنون ہیں اور جتنے جملہ باقیات ہیں وہ بھی سب ہمارے ہیں۔ اس میں جیسے میں نے عرض کیا ہے اموی تہذیب بھی شامل ہے، عباسی تہذیب بھی شامل

ہے، اس میں مصر کی فاطمی تہذیب بھی شامل ہے، صفوی تہذیب بھی شامل ہے اور مغلی تہذیب بھی شامل ہے۔ ان سب تہذیبوں میں جو اچھی باتیں پیدا ہوئی ہیں جو اچھی روایتیں ہیں اور جو اچھے واقعات ہیں وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب ہمارے ہیں اور ہمارے وطن میں جو چیزیں اسلام سے پہلے پیدا ہوئی ہیں وہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہماری ہیں۔ یہ تو میرے نزدیک اساس ہے جس پر کہ ہم اپنے مستقبل کی تہذیب کا ڈھانچہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ کا نظریاتی پہلو ہے۔

اس کے بعد دوسرے عملی مسائل پیدا ہوتے ہیں جو دو تین طرح کے مسائل ہیں اور غور طلب ہیں۔ ایک مسئلہ تو ان فاصلوں کا اور اختلافات کا ہے جو کہ ہمارے ہاں علاقائی تہذیبوں میں موجود ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے ارتباط کا اور ان کے اتحاد کا ہم کو کیا علاج سوچنا چاہیئے۔ یہ تھا پہلا مسئلہ۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نہ صرف علاقائی تہذیبوں میں ایک دوسرے میں فاصلہ ہے، بُعد ہے اور اختلاف ہے بلکہ ان علاقوں کے اندر بھی مختلف طبقوں میں اور ان کے رہن سہن میں فرق ہے اور ان کے اندر بھی دو طرح کی مقامی معاشرتی تہذیبیں ہیں۔ شہر کے رہنے والے تعلیم یافتہ لوگوں کی تہذیب الگ ہے۔ دیہات میں رہنے والے اَن پڑھ پس ماندہ لوگوں کی تہذیب الگ ہے اور اس فاصلے کو دُور کرنے کے لئے ہمیں کوئی صورت اختیار کرنی ہے تاکہ ہمارے ملک کی تہذیبی سطح میں کوئی یکسانیّت پیدا ہو سکے اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ یہ دوسرا سوال تھا اور اسی سے ملتا جلتا تیسرا سوال ہے کہ یہ دونوں چیزیں پیدا کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یعنی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے تو ہمیں فکر کرنا چاہیئے اور تحقیق کرنی چاہیئے۔ فکر کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت تحقیق ہے اور دوسری صورت مشاہدہ ہے۔

تحقیق ہمیں اس بارے میں کرنی چاہیئے کہ اس برِصغیر میں اسلام کے وارد ہونے کے بعد جو یہاں پر مختلف مقامی یا علاقائی تہذیبیں تھیں ان میں کیا کیا ترمیمیں ہوئیں اور اس نئی تہذیب کے یہاں پہ داخل ہونے کے سبب سے کون سی ایسی مشترک باتیں ہیں جنہوں نے ان مختلف

گروہوں میں اور ان مختلف تہذیبوں میں رواج پایا۔ اس بات پہ تحقیق لازم ہے۔ دوسری ہمیں اس بات پہ تحقیق کرنی ہے کہ ان مشترک چیزوں، مشترک قدروں اور مشترک علوم وفنون کے علاوہ جو اختلافات باقی رہ جاتے ہیں ان میں سے کون سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ باقی رکھنے کے قابل ہیں اور کون سی ایسی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بہتری ہے۔ مثال کے طور پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو لیجئے جن میں سب سے زیادہ بُعد ہے۔ سب سے زیادہ فاصلہ ہے۔ اگر آپ اپنی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پُرانے زمانے میں جو سرکاری یا حکومتی مختلف علاقائی تقسیمیں تھیں ان کے علاوہ ہمارے اولیاء کی اپنی ولایتیں بھی تھیں۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں جن بزرگوں اور جن اولیاء نے پہلے جاکر اسلام کی تبلیغ کی وہ دلّی سے بھیجے جاتے تھے۔ اسی طریقہ سے شمالی ہندوستان میں بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں سے مبلّغ اور بزرگ وصاحبِ دین لوگ مختلف مقامات پہ جنوبی ہندوستان اور وسطی ہندوستان میں بھیجے جاتے تھے۔ جو بزرگ دوسرے علاقے میں پہنچے وہ اپنی زبان ساتھ لے گئے وہ اپنی تہذیب ساتھ لے کے گئے اور بعض اوقات خطّاطی، موسیقی اور اس قسم کے فنون بھی اپنے ساتھ لے کے گئے۔ بعد میں چونکہ انگریزوں کی عمل داری میں یہ سارے رشتے کٹ گئے، اس لئے یہ بُعد اور فاصلہ آہستہ آہستہ پیدا ہوتا گیا اور بڑھتا گیا۔

چنانچہ ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ مختلف علاقائی زبانیں، مثال کے طور پر مشرقی پاکستانی کی بنگال زبان ہے اور ہماری اردو زبان ہے۔ ان میں کون سی چیزیں مشترک ہیں، تحقیق کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان میں بہت سے الفاظ بہت سی تراکیب اور زبان کے مزاج کی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لیکن فاصلہ کی وجہ سے اس اشتراک کا ہم کو احساس نہیں ہے۔ اختلاف کا ہم کو احساس زیادہ ہے اسی طریقے سے آپ مختلف فنون کو لیجئے۔ مثلاً ظروف سازی کو لیجئے۔ ٹائلوں TILES کو لیجئے۔ کشیدہ کاری کو لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے MOTIFS ایسے ہیں۔ یعنی جو بنیادی ڈیزائن ہوتا ہے، وہ کوئی سندھ سے چلا ہے اور بنگال میں پہنچا ہے۔ کوئی ڈھاکہ سے چلا ہے اور پشاور میں پہنچا ہے آپ اگر لاہور میں شاہی قلعہ دیکھیں تو آپ کو نوکھا نظر آئے گا جو کہ براہِ راست ڈھاکہ کی تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طریقہ سے تعمیر، لباس، خوراک، ظروف اور روزمرّہ کے استعمال کی بہت سی اشیاء ہیں۔ آپ کو بہت سی چیزیں ایسی ملیں گی جو کہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقے میں

گئی ہیں، لیکن اس وقت ہمیں ان کا رشتہ معلوم نہیں ہے۔ ایک تو آپ کو اس بارے میں تحقیق کرنی پڑے گی کہ یہ رشتے کہاں کہاں کس کس چیز کے کس کس چیز کے ساتھ ملتے ہیں اور پھر آپ کو ان رشتوں کو واضح کرنا ہوگا تاکہ یہ تہذیبی فاصلہ کم ہو جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو کہ خالص علاقائی ہیں اور جن کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست اس علاقے کی معاشرتی زندگی سے ہے۔ مثلاً پنجاب کا لباس اور ہے، سندھ کا اور، اور سرحد کا لباس اور ہے۔ کچھ آب و ہوا پر منحصر ہے، کچھ رسم و رواج پر منحصر ہے، یا یہ کہ بعض دست کاریوں کا خام مواد صرف سندھ میں ملتا ہے۔ اس لئے ان کی صرف سندھ میں ترقی ہوئی ہے بعض دوسری دست کاریاں ایسی ہیں جن کا خام مواد صرف پنجاب میں ملتا ہے۔ بعض دست کاریوں کا خام مواد سرحد میں ملتا ہے، بعض کا بلوچستان میں۔ آپ ان کو منتقل نہیں کر سکتے اور وہیں پر آپ ان کی ترقی کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زبانوں کا مسئلہ ہے۔ پنجابی، بلوچی، پشتو، کشمیری اور بنگالی زبان ہے۔ ان کو آپ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل نہیں کر سکتے۔ یہاں آپ کو لازم یہی ہے کہ ان سب زبانوں کو اپنے اپنے علاقے میں ترقی کرنے کا اور نشو و نما پانے کا موقع دیں اور ان کے پرانے ادب کے بارے میں تحقیق کر کے ان زبانوں کے پرانے ادب سے رشتے منسلک کرنے میں امداد دیں۔ آئندہ کے لئے جو ترقی کے اسباب ان زبانوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، نئے علوم کے ترجمے کے ساتھ، نئے خیالات کو منتقل کرنے کے ساتھ وہ ترقی کے اسباب بھی آپ مہیا کریں۔ چنانچہ پہلا کام جو ہمیں کرنا ہے وہ تحقیق کا کام ہے۔

اب مشاہدے پہ آئیے! مشاہدے کی صورت یہ ہے کہ یہ مسئلہ مختلف قومیتوں کا، مختلف تہذیبوں کا ایک ملک میں اور ایک قوم میں یکجا ہونے کا مسئلہ ہے۔ یہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا میں اور ملک بھی ایسے ہیں جنہوں نے اس قسم کے مسائل کا سامنا کیا ہے اور جن کو آج کل اسی قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ کینیڈا ہے، سوئٹزرلینڈ ہے، بلجیم ہے، یوگوسلاویہ ہے اور سب سے زیادہ روس ہے جس میں کچھ حد تک قومیتیں ہیں۔ اس مشاہدے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے جو ان سب قومیتوں کو ایک قومیت میں یکجا کرنے کے تجربے کئے ہیں ان میں کون سا تجربہ کامیاب ہوا ہے کون سا کامیاب نہیں ہوا ہے اور اس میں کون سی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن

سے ہم کو بچنا چاہیئے اور کون سی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جو کہ ہم اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ تو مشاہدے کا سوال ہوا۔ اس تحقیق اور مشاہدے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی صورت ہم ایسی پیدا کر سکیں گے جو کہ ہمارے حسبِ حال ہو۔ یہ تو پہلی بات تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو بُعدان پڑھ لوگوں اور پڑھے لکھّے لوگوں میں ہے۔ دیہات کے لوگوں اور شہر کے لوگوں میں ہے، شہر کی تہذیب اور دیہات کی تہذیب میں ہے۔ اس سے نپٹنے کی کیا صورت ہے۔ یہ ایک خالص اقتصادی اور سیاسی مسئلہ ہے جس کا براہِ راست حل ہم تہذیبی طور سے نہیں نکال سکتے۔ اس کا حل تو لازماً اسی معاشرے میں نکل سکتا ہے جس میں زندگی کی کم سے کم بنیادی آسائشیں اور انسانی ذہن کے لئے کم سے کم تعلیمی ضروریات ہم سب کے لئے عام کر سکیں۔ کیونکہ تہذیب کا وہ ترقی یافتہ مقام اس وقت تک کسی معاشرے میں حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں بنیادی طور پر ذہنی لوازمات موجود نہ ہوں۔ ذہن کا سب سے پہلا لازمہ تعلیم ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ کہ ہم کس قسم کا معاشرہ پیدا کریں جس میں یہ بنیادی اور مادی آسائشیں بھی اور ذہنی ضرورتیں بھی ہر کسی کے لئے پوری ہو سکیں۔ اس کا کوئی ایک نسخہ میرے ذہن میں نہیں ہے، کیونکہ اس کے مختلف نسخے ہیں جو مختلف مقامات پہ آزمائے جا چکے ہیں۔ یہ تو ہمارے سیاسی اور اقتصادی مفکّروں کو غور کر کے ہمیں بتانا چاہیئے کہ ہمارے لئے سب سے بہتر صورتِ حال کیا ہو سکتی ہے۔

عام طور سے جو جواب دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام سب سے بہتر ہے، لیکن یہاں میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے۔ آپ اتنے بڑے مسئلے کا دو الفاظ میں جواب نہیں دے سکتے۔ سوال تو یہ ہے کہ جس چیز کو آپ اسلامی نظام کہتے ہیں جب تک آپ اس کی تفصیل بیان نہ کریں اور یہ نہ بتائیں کہ کیونکر اس زمانے میں ورودِ اسلام سے لے کر اب تک طرح بطرح کی بادشاہیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی دنیا میں کتنی اسلامی مملک موجود ہیں۔ کہیں جمہوریت ہے، کہیں بادشاہت ہے، ڈکٹیٹر شپ ہے، کہیں نئی قسم کی سوشلزم ہے اور یہ سب لوگ اپنے آپ کو اسلامی کہتے ہیں۔ غیر اسلامی تو کوئی نہیں کہتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم اسلامی نظام چاہتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہے۔ ؟

بعض لوگ کہیں گے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جو نظام تھا وہ ہم رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں بھی میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسلامی نظام میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بہت سے قوانین ایسے بنائے گئے جو کہ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں موجود نہیں تھے۔ اس لئے کہ حالات بدل گئے تھے۔ حتیٰ کہ شاید میں عالمِ دین نہیں ہوں اور عالمِ دین زیادہ سمجھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ کے بعض احکام میں ترمیم بھی کی ہے۔ اسی لئے کہ حالات بدل گئے تھے۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم خلفائے راشدین کے زمانے کا نظام رائج کرنا چاہتے ہیں، تو یہ بھی جواز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ آپ اس زمانے کے حالات پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ جو بھی نظام پیدا کریں گے وہ اپنے حالات کے مطابق پیدا کریں گے۔ اگرچہ ان کے اصول اور ان کی روح وہی ہو گی جو کہ آپ کے دین کے اصول ہیں یا جو کہ آپ کے دین کی روح ہے۔ چنانچہ جو بھی آپ نظام پیدا کریں ضروری ہے کہ وہ آپ کے حسبِ حال ہو، آپ کے لئے مفید ہو اور موجودہ حالات کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمیں اپنے ان مسائل سے نبٹنے کے لئے تین طرح کے کام کرنے ہیں:

اوّل تو یہ کہ علمی اور تحقیقی فضا پیدا کرنی ہے جس میں کہ محض مفروضات محض نعرہ بازی اور محض سطحی خیالات کو دخل نہ ہو بلکہ جس کا تعلق حقائق سے ہو۔ غور و فکر سے ہو۔

دوسرا کام یہ کہ آپ کو سیاسی طور پر ایک ایسا مساویانہ نظام قائم کرنا ہے جو آپ کے مختلف علاقائی گروہوں اور ان کی مقامی تہذیبوں کو فروغ دے سکے تاکہ ایک طرف وہ آزادی سے اپنی زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ قومی اتحاد اور قومی یکجہتی میں بہت قریبی رشتے آپس میں پیدا کر سکیں۔

تیسرا کام ایک ایسا اقتصادی نظام پیدا کرنا ہے جس میں تہذیب اور علم کی رسائی آپ کے سب عوام تک ہو۔

سوال:۔ اشتراکی نظام میں وہ کون سی جاذبیت ہے جو اسلامی نظام میں نہیں پائی

جاتی جس کی بنا پر پڑھے لکھے طبقے کے لوگ بیت اللہ کی طرف دیکھنے کے بجائے ماسکو کی طرف متوجہ ہیں۔ ؟

جواب :۔ اصل میں یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیئے۔ مجھ سے نہیں، لیکن جیسے میں عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت دنیا میں بہت سے مسلمان ملک ہیں جن میں مختلف قسم کے نظام رائج ہیں۔ مصر ہے، شام، سعودی عرب، پاکستان ہے اور انڈونیشیا ہے۔ ان میں سے آپ کس کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ جس کی طرف آپ کہتے ہیں لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی۔ ماسکو اور چین آپ کے سامنے عملی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں جو کچھ ہے لوگوں کو نظر آتا ہے۔ مثلاً وہاں کے لوگوں کو روٹی ملتی ہے، تعلیم ملتی ہے۔ وہاں چند ایک اور بھی آسائشیں مہیا ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس وقت کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جس کی طرف لوگ رجوع کریں یا جس کو آپ کہیں کہ اس ملک کا نظام روس اور چین سے بہتر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں آج کل کے زمانے میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جس میں کہ عوام کو اتنی آسائشیں حاصل ہیں جتنی کہ روس اور چین میں حاصل ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام میں کوئی خرابی ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو اسلامی نظام رائج ہیں، ان میں نقائص موجود ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ان نقائص کی اصلاح ہو جائے اور ان میں روس اور چین سے بہتر حالات پیدا ہوں جو ہو سکتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ نہ ہوں تو لوگ اُس طرف رجوع نہیں کریں گے اِس طرف کریں گے۔ تو اس کا علاج یہی ہے کہ روس اور چین کی شکایت کرنے کے بجائے اپنے آپ سے شکایت کرنی چاہیئے کہ ہم نے ایسے حالات کیوں نہیں پیدا کئے۔

سوال :۔ چین میں ثقافتی انقلاب کا ظاہری طور پر کامیاب تجربہ دنیا کو دکھایا جا رہا ہے۔ کیا اسی رنگ کا کوئی حل پاکستان کی معیشت کے لئے سود مند ہو گا ؟ جس کی بنا پر کوئی اسلامی عمارت تعمیر کی جائے۔ ؟

جواب :۔ صاحب! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ سوال آپ اپنے سیاسی اور اقتصادی مفکروں سے پوچھئے۔ میں تو تہذیب کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ چین میں جو ثقافتی انقلاب ہوا ہے، ظاہری طور پر وہ وہاں کے حالات کے مطابق کامیاب ہے۔ ہر

ملک کے اپنے حالات ہوتے ہیں اور انہی حالات کے مطابق اس کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔ ہم جو بھی حل اپنے لئے تجویز کریں وہ ہمارے حالات کے مطابق اور ہماری فکر کے مطابق ہو۔ اسی قسم کا حل ہمارے لئے کامیاب بھی ہو گا اور مفید بھی۔ جو چیزیں دوسروں نے کی ہیں، ان میں سے اچھی چیزیں جو ہمارے کام آسکتی ہیں ہم ان سے سبق سیکھ سکتے ہیں، ان کو شامل کر سکتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ممکن ہے بہت سی چیزیں ایسی ہوں جن میں ہم اپنی طرف سے اپنے نقطۂ نظر سے اور اپنے دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اضافہ کر سکیں۔

سوال :۔ اسلام کو دائمی دین تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں تمام زمانوں کے لئے احکام نہیں ہیں، بلکہ نئی تاویل لازم ہے تو یہ بات سب اہلِ مذہب کر رہے ہیں، لہٰذا اسلام کی خصوصیت کیا ہوتی۔؟

جواب :۔ یہ سوال بھی کسی عالمِ دین سے کرنا چاہیئے کیونکہ میں اس کا جواب دینے کا اہل نہیں ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ ہر مذہب میں چند بنیادی اصول دائمی ہوتے ہیں اور ان اصولوں کا اطلاق ہر زمانے کے حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے، جیسا میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی حالات بدلتے رہے، لیکن دین تو تبدیل نہیں ہوا۔ دین وہی رہا۔ دین کے احکامات و اصول بھی وہی رہے، لیکن حالات کے مطابق نئے مسائل پیدا ہوتے۔ ان مسائل سے نپٹنے کے لئے تاویل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اصولوں کے صحیح اطلاق کی ضرورت ہے۔ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے مختلف اصولوں کے اطلاق مختلف طریقوں سے ہوتے رہے ہیں۔

سوال :۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب اخلاقی تنزل کا باعث ہے۔ اگر اس کے باوجود پاکستانی مغربی تہذیب کو اپنانے کے لئے تیزی سے کام کر رہی ہے، تو آپ کے نزدیک پاکستانی تہذیب کا انجام کیا ہو گا۔؟

جواب :۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو مغربی تہذیب میں دو عناصر ہیں: ایک علوم و فنون اور دوسرے وہاں کا معاشرہ اور معاشرے کا اخلاق۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو مغربی یورپ ہے۔ فرانس، انگلستان اور جرمنی، ان کو کئی طرح کے اخلاقی مسائل کا سامنا ہے اور

وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں جرائم بڑھ رہے ہیں اور اخلاق کی صورت بگڑتی جارہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے علوم میں ترقی بھی ہو رہی ہے۔ ان کے ہاں سائنس میں ترقی ہو رہی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمیں اپنی تہذیب اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس اپنی تہذیب میں مغربی تہذیب کے جو اچھے عناصر ہیں وہاں کی سائنس ہے، علوم ہیں، فنون کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ان چیزوں کو ہم اپنا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ سائنس تو ایک عالم گیر چیز ہے۔ سائنس کسی ملک کی قید میں نہیں ہے۔ اسی طرح فنون میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو عالم گیر ہیں۔ ہم کو مغربی تہذیب اپنانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے ہم کو اپنی تہذیب کو ترقی دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ہمیں جہاں سے بھی کوئی اچھی بات ملے، علم حاصل ہو، اسے اپنانا چاہیئے اور اگر ہم یہ صورت اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان کی تہذیب کا انجام اچھا نہ ہو۔

سوال:۔ (۱) بنگالی اور اردو کو ملا کر ایک تیسری نئی زبان بنانے کی جو کوشش کی جارہی ہے کیا وہ پاکستان کی تہذیب پر اثر انداز ہوگی۔؟

(۲) مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتحاد مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ مذہب انہیں متحد رکھتا ہے تو بہت سے اسلامی ملک پاکستان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ تہذیب کا باعث ہے تو دونوں حصوں کی تہذیب پورے برِاعظم کی تہذیب ہے۔ اس صورت میں دوسرے ممالک کو پاکستان سے کیوں خارج کیا جائے۔؟

جواب:۔ پہلے بنگالی اور اردو کا قصہ لیجئے۔ اس وقت جو کوشش کی جارہی ہے کہ چند بنگالی کے لفظ اردو میں شامل کر لئے جائیں اور اردو کے چند الفاظ بنگالی میں شامل کر دیئے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قطعی مہمل بات ہے۔ اس سے نہ زبانیں قریب آتی ہیں اور نہ اس سے ایک دوسرے سے افہام و تفہیم ہوتی ہے۔ اس کے بجائے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ بنگالی اور اردو میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ ان کو ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً پوربو پاکستان کو ہمارے ہاں پوربو پاکستان کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ پوربی لفظ ہمارا ہے۔ اگر آپ پوربو کی بجائے پوربی کہیں، تو وہ کوئی غیر مانوس بھی نہیں ہے اور بنگالی

بھی سمجھ لیتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ بنگالی میں بہت سے ایسے الفاظ ملیں گے جو اردو میں آپ کو قابلِ فہم نظر آئیں گے اور اردو میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو کہ بنگالیوں کے لئے قابلِ فہم ہوں گے۔ اس لئے پہلے تحقیق کی جائے۔ بغیر تحقیق کے اگر آپ کوئی نسخہ استعمال کریں گے تو وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ غور اس بات پر کرنا چاہیئے کہ کس حد تک یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آسکتی ہیں اور کس حد تک ان کو الگ رہنا چاہیئے۔ اب ایک نسخہ اس کا یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ رسم الخط ایک ہو۔ لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ نہ ہم ان کا رسم الخط اپنانے کے لئے تیار ہیں اور نہ وہ ہمارا اپنانے کو تیار ہیں۔ ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ دونوں رومن رسم الخط اپنائیں۔ اس لئے کہ وہ دونوں میں مشترک ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں اختلاف بھی ہے۔ اور بعض لوگ اتفاق بھی کرتے ہیں لیکن یہ جذباتی مسائل نہیں ہیں۔ ان کو بالکل جذبات سے الگ ہو کر سوچنا چاہیئے۔ ان کو خالص علمی اور تحقیقی طریقے سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ان دونوں زبانوں کو قریب لانے کے امکانات کیا ہیں اور ان میں سب سے بہتر صورت کون سی ہے میں اس بارے میں فی البدیہہ کوئی حل پیش نہیں کر سکتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا اتحاد مصنوعی ہے اور اگر ہے تو کس وجہ سے۔ یہ الگ الگ کیوں نہ ہو جائیں۔ یہ بھی ایک خالص سیاسی سوال ہے کہ اسلامی ملک اور بھی ہیں۔ آخر مغربی پاکستان و مشرقی پاکستان ساتھ کیوں رہیں۔ میری رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل دین کا اشتراک ہے جو سب سے بڑی وجہ ہے لیکن صرف یہی رشتہ نہیں ہے کیونکہ اگر صرف یہی ایک رشتہ ہو تو یہ اعتراض بجا ہے کہ اسلام کا رشتہ تو دوسرے اسلامی ممالک سے بھی ہے تو وہ پاکستان میں شامل کیوں نہ ہوں اور اگر ایک ملک دوسرے ملک سے الگ ہو کے بھی یہی رشتہ قائم رکھ سکتا ہے تو پھر مشرقی پاکستان الگ کیوں نہیں ہو جاتا۔ اس اعتبار سے یہ ایک بنیادی سوال ہے جس پر ہم نے آج تک غور نہیں کیا اور مجھے ان سیاستدانوں سے اس کی شکایت ہے جو فقط یہ کہتے ہیں کہ تعلق کا صرف اسلامی رشتہ ہے۔ اگر صرف اسلامی رشتہ ہے تو وہ دوسرے ملکوں سے بھی ہے اور جغرافیائی اعتبار سے ہم افغانستان اور ایران سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کے ساتھ ہم کیوں نہیں شامل ہو جاتے اور مشرقی پاکستان، ملائیشیا و

انڈونیشیا سے زیادہ قریب ہے وہ ان کے وفاق میں کیوں نہیں شامل ہو جاتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دینی رشتے کے علاوہ دو تین رشتے اور بھی ہیں۔

ایک تو تاریخی رشتہ ہے کہ ہم ایک زمانے تک ایک ہی حکومت اور ایک ہی سلطنت سے منسلک رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارا تاریخی رشتہ۔ دوسرا ہمارا ان سے تہذیبی رشتہ ہے۔ وہ یہ کہ علاوہ زبان کے اگر آپ آج بھی مشرقی پاکستان جائیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہاں کی مسجدیں ایسی ہیں جیسی کہ ہماری۔ وہاں کے مقبرے بھی ایسے ہی ہیں جیسے کہ ہمارے اس حصّے کے، ہمارے اولیاء، دلّی سے ہمیشہ وہاں جاتے رہے ہیں وہاں کے اولیاء دلّی آتے رہے ہیں۔ ان کی خوراک دیکھیں جو پلاؤ وہ کھاتے ہیں وہی ہم کھاتے ہیں۔ غرضیکہ بہت سے تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی رشتے دینی رشتوں کے علاوہ ہمارے ان کے ساتھ ہیں۔ دینی رشتہ تو سب سے بڑا رشتہ ہے لیکن اس کے علاوہ ہمارے ان سے چند مخصوص رشتے ہیں جو کہ دوسرے اسلامی ملکوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک ہیں۔ اور مغربی پاکستان و ایران ایک ملک نہیں اور مشرقی پاکستان اور ملائیشیا ایک ملک نہیں ہے۔

سوال :۔ ہمیں علاقائی زبانوں کو ہر ممکن ترقی دینی چاہیئے۔ کیا اس صورت سے اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق ہے؟ کیونکہ موجودہ پاکستان کے کسی علاقے کی زبان اردو نہیں ہے۔

جواب :۔ میری رائے میں علاقائی زبانوں کو ترقی دینے سے نہ صرف اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے بلکہ اردو کی ترقی کی کوئی دوسری صورت ہے ہی نہیں۔ اردو ہی ایک ایسی مشترک زبان ہے جو کہ سب علاقوں میں سمجھی جاتی ہے، اس لئے اردو کو موجودہ صورت سے آگے بڑھانا ہے تو ظاہر ہے اس میں جو بھی نئے عناصر شامل ہوں گے اور اس میں ترقی کی جو بھی نئی صورتیں پیدا ہوں گی وہ اب لکھنؤ اور دلّی سے تو نہیں آئیں گی۔ لکھنؤ، دلّی اور قلعہ معلی تو وہاں رہ گئے۔ اب اردو کو اگر اس ملک میں ترقی کرنا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ یہاں کی مقامی زبانوں سے اس کا رشتہ پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ قریبی طور سے پیدا کیا جائے۔ اور اگر ان زبانوں میں ترقی ہو گی تو لازم ہے کہ ان سب علاقوں میں جو مشترک زبان ہو گی اس میں بھی ترقی ہو گی۔ میں مقامی زبانوں کی ترقی کو نہ صرف اردو کے لئے منافی نہیں سمجھتا بلکہ اردو کی ترقی کے لئے ایک شرط بھی سمجھتا ہوں۔

ٹی وی پر پہلا خطاب

پاکستانی ثقافت اور اس کے مسائل

آج سے دو چار دن پہلے جب مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں پاکستانی ثقافت اور پاکستانی فنون کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں تو میں نے اس وقت مروّت میں ہاں کر دی مگر بعد میں جب اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ اوّل تو اس لیے کہ یہ موضوع اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ ایک نشست میں سب کچھ سمیٹنا بہت مشکل ہے، دوم یہ کہ گزشتہ بیس پچیس برس میں اس موضوع پر اتنی باتیں ہو چکی ہیں کہ اب میں کون سی نئی بات آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ میں جو کچھ کہوں گا یقیناً وہ ایسی باتیں ہوں گی جو آپ اس سے پہلے کئی بار سن چکے ہوں گے۔

کلچر پر گفتگو کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری ہے، کم از کم دو بار اس پر نہایت طویل گفتگو ہو چکی اور غور کیا جا چکا ہے، ہمارے دوست عبدالحفیظ کاردار اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں، ایک بار تو ان کے ساتھ مل کر رپورٹ بھی مرتّب کی تھی اور کوئی دس پندرہ برس پیشتر اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا گیا تھا۔ شاید اس جائزے سے لوگوں کی تشفّی نہیں ہوئی اس لیے ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی۔ یہ کوئی سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے اس کمیٹی نے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ کلچر کے مسئلے پر غور کیا۔ یہاں بانو قدسیہ بھی تشریف فرما ہیں۔ وہ بھی اس کی رکن تھیں۔ ہم نے اپنی رپورٹ مرتّب کرنے سے پہلے پشاور سے لے کر چٹاگانگ تک تقریباً ہر بڑے شہر کا دورہ کیا۔ تین سو سے زیادہ اہلِ دانش، اہلِ فکر اور اہلِ نظر سے گفتگو کی، اور اس کے بعد رپورٹ مرتّب کی جو یہاں اس وقت میرے سامنے ہے، اس رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ میری یا بانو قدسیہ یا کسی دوسرے رکن کی ذاتی یا انفرادی رائے نہیں تھی بلکہ ملاقاتوں اور گفتگو سے اس وقت جو نتائج جمع اور مرتّب ہوئے وہ اس

مں درج ہیں اور ان پر ہم لوگوں کا اتفاق رائے تھا۔ آج مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ ایک طرح سے ان آرا۔ کا خلاصہ ہے جو ہم نے ملاقاتوں میں سنیں اور ہمارے سامنے پیش کی گئیں۔

آج سے دو تین برس پہلے ہم عید ملنے کے لئے کسی کرم فرما کے گھر گئے تھے، وہاں خاتونِ خانہ مجھ سے کہنے لگیں، ابھی کچھ دن ہوتے ہمارے ڈرائیور کی بچّی کی شادی ہوئی تو میں نے پوچھا بھئی تمہارا داماد کیسا ہے؟ اس نے جواب دیا صاحب ویسے تو اچھا لڑکا ہے کوئی خرابی نہیں ہے لیکن وہ سیر ویر (یعنی شعر ویر) بہت کہتا ہے اور اخباروں اور رسالوں میں چھپواتا بھی ہے، بیگم صاحبہ نے اسے جواب دیا اس میں کیا بُرائی ہے شعر تو ہمارے فیض صاحب بھی کہتے ہیں، ڈرائیور بولا صاحب ان کی بات دوسری ہے۔ وہ امیر آدمی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے لئے یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ کلچر اور فنون کے بارے میں ایک تو ہمارا تصور یہ ہے۔ کہ یہ تو امرا۔ کی عیاشی کی چیز ہے۔ وہ کریں تو ٹھیک ہے دوسرے لوگوں کا اس سے کیا واسطہ۔

اس سے ملتی جلتی بات، قدرے مختلف انداز میں میں نے کچھ پہلے اسلام آباد میں سنی۔ کوئی صاحب اپنے کسی ثقافتی منصوبے کے سلسلے میں ایک درخواست لے کر کسی وزارت میں پہنچے۔ انہیں اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے کچھ پیسے درکار تھے۔ وہاں انہیں جواب ملا، ہمارے پاس اگریکلچر کے لیے روپیہ نہیں ہے اور تم کلچر لیے پھرتے ہو۔ یہ کلچر ولچر رکھو اپنے پاس روٹی کپڑا امکان اور دوسری ضرورتیں پوری ہونے کے بعد پیسہ آئے گا تو اس وقت بات کریں گے، کلچر کی۔ یہ ضروریات پوری کرلیں اس کے بعد کلچر سے بھی نمٹ لیں گے۔

ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ زندگی کی تمام ضروریات اور تقاضے پورے ہونے کے بعد کلچر اور اس کے متعلقات کے بارے میں غور کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے ملک میں کلچر کا روزمرّہ کی زندگی اور ہماری قومی ضروریات کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے، گویا یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔

دوسرا نقطۂ نظر بھی سُن لیجئے۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ دراصل کلچر تو طبقاتی ہوتا ہے۔ یعنی کلاس کلچر۔ ہمارے ہاں امرا۔ ہیں، غربا۔ ہیں، کسان ہیں، مزدور ہیں، سرمایہ دار ہیں اور افسر لوگ ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر کے حامیوں کا خیال ہے کہ یہ جو الگ الگ طبقے ہیں

توان کا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ مزدوروں کا کلچر الگ، کسانوں کا کلچر الگ، سویلیں کا کلچر الگ، نوابوں کا کلچر الگ اور جاگیرداروں کا کلچر الگ۔ ان سب سے ماورا۔ پاکستانی کلچر یا پاکستان کے قومی کلچر کی تلاش بے کار سی بات ہے کیونکہ کلاس یا طبقے سے الگ کوئی کلچر نہیں ہوتا۔

اس سے ملتی جلتی ایک اور بات بھی سننے میں آتی ہے۔ ہمارے نوجوان دوست کہتے ہیں کہ سندھی کلچر ہے، بلوچی کلچر ہے، پختون کلچر ہے، پنجابی کلچر ہے، ہر جگہ کے الگ الگ کلچر ہیں اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ ان سے الگ یا ان کے اوپر کسی قومی کلچر یا ثقافت کی تلاش کرنا بے کار ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ایک اور بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ صاحب ہمارا ملک اسلامی ہے اس لیئے ہمارا کلچر اسلامی ہے۔ اسلامی کلچر کے ساتھ پاکستانی کا دم چھلا لگانا یا یہ تلاش کہ کلچر سے ہٹ کر کوئی الگ تھلگ سی چیز ایسی ہے جسے ہم اپنی مخصوص ثقافت یا کلچر کہہ سکیں محض شرارت کی باتیں ہیں۔ اور اس شرارت کا ایک مقصد یہ ہے کہ ملک میں لادینی پھیلائی جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ سندھی، پنجابی، بلوچی اور پختون کا فساد پیدا کر کے قومی وحدت کو نقصان پہنچایا جائے۔

ایک درسی کتاب کا نام ہے "اسلامی تہذیب و تاریخ" جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ بی اے کے نصاب میں ہے۔ اس کے پانچ چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ یا تو یہ کتاب نصاب میں شامل ہے یا اگر نہیں بھی ہے تو طلبہ کے لیئے اس کا مطالعہ غالباً لازمی ہے تب ہی تو پانچ چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں یہ لکھا ہے۔

"تہذیب کے معنی اصلاح و تربیت کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا ہم معنی لفظ کلچر ہے چنانچہ تہذیب نظریئے اور عقیدے کا نام ہے۔"

یہ تو تہذیب کی تعریف ہو گئی۔ اس کے بعد لکھا ہے تمدن کسی ملک کی طرزِ معاشرت کا نام ہے۔ انسان قطعی طور پر معاشرتی طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے، چنانچہ رشتہ داری، دوستی، ہمسائیگی اور دوسرے تعلقات سب تمدن کی تعریف میں آتے ہیں۔

غالباً کتاب کے مؤلف نے سوی لیزیشن اور کلچر کو اوپر نیچے کر دیا ہے لیکن خیر اسے

چھوڑیے۔ آگے دیکھیے یہ اسلامی تہذیب اور تمدن کی کیا تعریف کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں اسلامی تہذیب کے عوامل پانچ عقائد ہیں جو اجزائے ایمان ہیں۔ پہلا عقیدہ اللہ پر ایمان۔ دوسرا عقیدہ فرشتوں پر ایمان۔ تیسرا عقیدہ آسمانی کتب پر ایمان۔ چوتھا عقیدہ انبیاء پر ایمان۔ اور پانچواں عقیدہ آخرت پر ایمان۔ مؤلف کے حساب سے یہ جو پانچ عقائد ہیں یہی آپ کا کلچر ہیں۔ باقی رہ گئی تہذیب تو انہوں نے اسلامی تہذیب کے عناصر یہ پانچ ارکان گناتے ہیں۔

پہلا رکن اقرارِ کلمہ طیبہ۔ دوسرا رکن نماز۔ تیسرا رکن زکوٰۃ۔ چوتھا رکن روزہ اور پانچواں رکن حج۔

عقائد اور ارکان گنا کر انہوں نے تمام اسلامی کلچر اور تہذیب کا فیصلہ کر دیا۔ اس ساری کتاب میں یا کم از کم اس کے مقدمے یا دیباچے میں بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ ادب، شاعری یا کوئی فن یا تعمیرات، آپ کے لباس آپ کی زبان وغیرہ کا کوئی تعلق آپ کے کلچر یا آپ کی تہذیب سے ہے۔

اگر مؤلف کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو وہ تمام چیزیں جن پر آپ فخر کرتے ہیں ان کے نقطۂ نظر سے کلچر کی تعریف سے خارج ہیں۔ ہماری شاعری میں سعدی ہیں، حافظ ہیں، رومی، اقبال ہیں، فردوسی ہیں، غالب ہیں، میر ہیں اور پھر تاج محل ہے، سمرقند و بخارا ہیں، البیرونی اور ابنِ خلدون ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ سارے علوم و فنون جو آپ نے دنیا کو دیئے ہیں وہ یکسر خارج اور ان صاحب نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھ دیا بس وہی ہے۔ اسلامی کلچر چونکہ ہم اسلامی مملکت ہیں اس لیئے یہی ہمارا کلچر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کی اجازت نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک لحاظ سے ان کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے۔ اس طریقے سے غلط نہیں ہے کہ وہ عنصر جو اسلامی ممالک میں مشترک ہے اور جس کو ہم صحیح معنوں میں اسلامی کہہ سکتے ہیں اور جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے یعنی ہمارے عقائد وہ اسلامی کلچر کے دائرے میں آتے ہیں۔ تمام مسلمانوں میں مشترک یہی ہمارے عقائد ہیں لیکن آپ کسی طریقے سے یہ نہیں کہہ

سکتے کہ کسی قوم یا کسی ملک کی ثقافت یا کلچر کا پوری طرح احاطہ ان صاحب کی یہ تعریف کرتی ہے۔
آپ کو ماننا پڑے گا کہ کسی ملک کے اپنے مخصوص مزاج ثقافت اور تہذیب میں متذکرہ عقائد کے علاوہ بہت سی ایسی چیزوں کا دخل ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر زبان ہے، غذا ہے، رہن سہن کے طریقے ہیں، رسم و رواج ہیں۔ ادب ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عقیدے کا ان سب پر اثر ہوتا ہے۔ اگر مسلمان ایک مشترکہ عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کی ثقافتوں میں بھی ایک مشترک عنصر موجود ہوگا لیکن اس اشتراک کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر جگہ اپنے اپنے ملک کا اور اپنی اپنی قوم کا ایک مخصوص کلچر بھی ملے گا۔ اس کے بارے میں بھی مجھے شاید بعد میں پھر تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہو۔

آئیے پہلی بات کی طرف کہ پہلے ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں اس کے بعد کلچر کی طرف رجوع کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ ثقافت تو ایک عملِ تشخّص کا نام ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ انسان کو یہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اس کے خدوخال کیا ہیں یا کسی کو اپنے خدوخال کا علم ہی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی شخصیّت مفقود ہے۔ اسی طرح قومی ثقافت زندگی سے، قومیّت کے وجود سے یا کسی وطن کے وجود سے الگ اور علیٰحدہ نہیں ہوتی۔ وہ تو اس کا داخلی حصّہ ہے۔ اگر سیاسی اعتبار سے آپ نے اس کا تشخّص اور تعیّن نہیں کیا تو پھر وہ قوم کیسے موجود ہے۔ ہے سیاسی اعتبار سے لازم ہے کہ اپنے قومی وجود کو مستحکم کریں اور اس کو دنیا سے منوانے کے لیئے اپنے داخلی وجود کو داخلی طور سے منضبط کریں اس استحکام کو منوانے اور منضبط کرنے کے لیئے لازمی شرط ہے کہ ہم اپنی ثقافت کو نہ صرف پہچانیں اس کی شناخت کریں بلکہ اس کی اہمّیت کو تسلیم کریں اور جس قدر ممکن ہو اس کی خدمت کریں۔

اگر اقتصادی نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھیں تو یہ کہا جائے گا کہ جس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے وہ روٹی حاصل کرے گا یا گانا بجانا کرے گا۔ پہلے روٹی اس کے بعد کچھ اور۔ یہ مثال کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جو غریب ہیں اور جن کے پاس ضروریات زندگی مہیّا کرنے کے لیئے کچھ بھی نہیں ہے یا کافی نہیں ہے انہیں بھی تفریح پسند ہے اور تفریح کی ضرورت ہے،

کسی نے جاکر تھیٹر دیکھ لیا۔ سینما چلا گیا، کبڈی کھیل لی یا ہیر سُن لی۔ وہ بھی اپنی تفریح کے لیئے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی اس تفریح اور تلاشِ روزگار میں کسی قسم کا تضاد ہے۔ تفریح اس کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی روٹی۔ اجتماعی طور پر بھی قوموں کو یا گروہوں کو یا معاشرے کو اپنی روح کی تسکین کے لیئے کچھ ضرورتیں پیش آتی ہیں۔

انگریز کے زمانے میں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کچھ محکمے ایسے تھے جن کا تعلق براہِ راست حکومت کے نظم و نسق سے تھا۔ وہی باقاعدہ محکمے سمجھے جاتے تھے۔ مال کا محکمہ، مواصلات کا محکمہ وغیرہ۔ لیکن جن کا تعلق قوم کی تربیت سے ہے ——— اور قوم اس وقت انگریز کی رعایا تھی ——— ان محکموں کو کہا جاتا تھا بینی فیشنٹ ڈپارٹمنٹس یعنی خیراتی محکمے۔ اس وقت سمجھا یہ جاتا تھا کہ اصل محکموں سے کچھ پیسہ بچ رہا تو یہ خیرات کر دیں گے یعنی خیراتی محکموں میں تقسیم کر دیں گے۔ کلچر کا انگریز کے زمانے میں کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہماری سوچ بھی ایسی ہی رہی اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ تعلیم اور صحت کو تو ہم نے ایک حد تک مان لیا کہ چلو یہ ضروریات ہیں کیونکہ اگر لوگ غیر تعلیم یافتہ یا بیمار ہوں گے تو وہ قومی ترقی میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہو سکیں گے مگر حیرت ہے کہ کلچر کو تو ہم نے بینی فیشنٹ ڈپارٹمنٹ میں بھی نہیں رکھا۔ اس کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ہماری قومی زندگی کے جتنے شعبے ہیں ——— خواہ وہ ریاستی سطح کے ہوں یا عوامی سطح کے ——— ان میں ہم نے ابھی تک یہ تسلیم ہی نہیں کیا کہ جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہماری روحانی ضروریات اور جذباتی و فکری ضروریات بھی ہیں جو ثقافتی ذرائع سے پوری ہو سکتی ہیں۔ ان کا بھی کوئی ذکر آپ کی منصوبہ بندی میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ پہلے آپ کی وہ ضروریاتِ زندگی پوری ہوں جن کا پہلے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ہم کلچر پر غور کریں جو کہ لہو و لعب کی یا عیاشی کی چیز ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غالباً آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کہ کلچر زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا کسی نہ کسی طرح عمل دخل ہوتا ہے۔ کلچر داخلی طور پر آپ کی اقدار کا نظام ہے اور ظاہری طور پر آپ کے طریقِ زندگی کا نام ہے۔ آپ

کے ہر کام میں کلچر یا ثقافت کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر آپ اس سے چشم پوشی کریں گے تو اس سے کوئی نہ کوئی فتور واقع ہوگا جو آج کل ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہے۔

آج کل یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تعلیم سرمایہ ہے۔ جس طرح آپ کسی اور کام میں پیسہ لگاتے ہیں اور اس سے آپ کو کچھ یافت ہوتی ہے منافع ملتا ہے اسی طرح تعلیم بھی سرمایہ کاری ہے۔ جس شخص پر آپ یہ سرمایہ لگاتے ہیں اس میں سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا ہوتی ہے، یہ مہارت فکری اور جذباتی طور سے اور دوسرے طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ بھی کام کرتا ہے سہولت سے اور بہتر طریقے سے کرتا ہے اور اس سے آپ کے قومی سرمائے میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ تعلیم پر آپ خرچ کرتے ہیں وہ خیرات نہیں کرتے بلکہ سرمایہ ہے جو تعلیم پر لگاتے ہیں اور بہتر کارکردگی کی صورت میں منافع حاصل کرتے ہیں۔ فرداً فرداً بھی، اجتماعی طریقے سے بھی اور قومی سطح پر بھی۔ واضح رہے کہ تعلیم اور ثقافت کو آپ ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگر تعلیم سرمایہ ہے جس سے آپ کی یا قوم کی یافت ہوتی ہے تو اسی کا ایک لازمی حصّہ ثقافت بھی ہے۔ اس سے بھی یافت ہوگی۔ اور ہوتی ہے۔

میں ایک معمولی مثال دیتا ہوں۔ آپ کے ہاں میز بنتے ہیں، کرسیاں بنتی ہیں۔ یہ اسٹوڈیو ہے۔ آپ کے گھر میں روزمرّہ زندگی کی اشیاء موجود ہیں۔ مختلف استعمال کی چیزیں کارخانوں میں تیار ہوتی ہیں۔ ان میں ہر چیز یعنی میز کرسی الماری وغیرہ کی تخلیق میں آخر کوئی نہ کوئی جمالیاتی عنصر تو شامل ہوتا ہے اس کا ڈزائن، نقشہ، رنگ روغن، شکل وصورت وغیرہ۔ ان چیزوں کے بنانے والوں میں سلیقہ نہ ہو اور ان کے ذہن میں کسی قسم کا جمالیاتی عنصر نہ ہو تو ظاہر ہے وہ نہایت بُری اور بھدّی چیزیں تیار کریں گے۔ اگر آپ ان کاریگروں کو تعلیم دلوانے کے ساتھ ساتھ ان کی جمالیاتی حس کو تیز کریں، ان کے لیے بصیرت کے زیادہ مواقع فراہم کریں تو ان کی بنائی ہوئی میز کرسیاں اور دوسری اشیاء پہلے سے بہت بڑھیا ہوں گی۔ دوسرے لفظوں میں ان کو تعلیم یافتہ کے ساتھ "کلچر یافتہ" بھی ہونا چاہیے۔

سرمایہ دارانہ طریقے سے سوچتے تو بھی اس سے کچھ نہ کچھ آپ کے قومی اثاثے میں اضافہ

ہوگا اس لئے یہ بات بھی غلط ہے کہ آرٹ اور کلچر یا فن اور ثقافت عیاشی کی چیزیں ہیں۔

اب قومیتوں کی بات پر غور کیجیے یعنی سندھی بلوچی پختون اور پنجابی۔ اس سلسلے میں دو طرح کے خیالات ہیں، ایک تو یہ کہ اگر ان علاقائی ثقافتوں اور ان کے فنون پر زیادہ توجہ کی جائے تو اس سے قومی وحدت کو نقصان پہنچے گا۔ سب اپنی اپنی اور الگ الگ بنسری بجائیں گے۔ اور قومی راگ بے سُرا ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے صرف ایک پاکستانی کلچر ہی کا ذکر کیا جائے، اس سے الٹ بات یا دوسرا خیال یہ ہے کہ صرف علاقائی کلچر ہی ہے۔ اس سے بالا یا اس سے ماورا۔ کوئی کلچر نہیں ہے۔ یعنی اس دوسرے نقطۂ نظر کے حامیوں کے نزدیک پاکستانی کلچر قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

جس کو ہم اپنا قومی ورثہ کہتے ہیں یا جسے ہم اپنی قومی ثقافت قرار دے سکتے ہیں ظاہر ہے وہ ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے جو کہ ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ سرحد، سندھ، پنجاب، اور بلوچستان کے علاقوں میں جو کچھ موجود ہے ان سب کے اشتمال سے ہی وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے ہم پاکستانی کلچر کہتے ہیں جغرافیائی اعتبار سے بھی اور قومی اعتبار سے بھی۔ اگر قومی اعتبار سے ہمارے مختلف علاقوں کے لوگ ہماری قومیّت کی تشکیل کرتے ہیں تو پھر ان ہی علاقوں کی ثقافت ہماری قومی ثقافت کی تشکیل کیوں نہیں کرتی۔ ہے اس کیوں کے جواب میں کہا جاتا ہے "ہم تو ایک قوم ہیں اس لیے چار کلچر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے"۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا جو لوگ طبقاتی کلچر کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں ایک قوم نہیں چار قومیں یا قومیتیں ہیں۔ دونوں کے دلائل میں بنیادی نقص ایک ہی قسم کا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ طبقاتی نظام میں ایک قوم کے اندر ذیلی قومیں ہوں گی اور ان ہی کو ہم طبقات کہتے ہیں۔ امراء بھی ہوں گے، شرفاء بھی ہوں گے اور غرباء بھی ہوں گے۔ اگر آپ کا معاشرہ ان طبقات میں بٹا ہوا ہے تو آپ کی ثقافت بھی اسی طرح کی مختلف شکلیں اور زاویے اختیار کرے گی۔ امراء کا کلچر الگ ہوگا، شہر کا جو کھاتے پیتے لوگ ہیں ان کا کلچر الگ ہوگا، غرباء کا کلچر الگ ہوگا ——— یہ سب تسلیم لیکن ایک سے زائد کلچروں کی موجودگی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کی ایک ریاست کے اندر ایک سے زائد ریاستیں ہیں۔ ریاست

تو ایک ہی ہوگی۔ اور اگر ریاست ایک ہے تو ظاہر ہے قوم بھی ایک ہی ہوگی۔ اس ایک قوم کے بطن میں، اس ایک قومی ثقافت کے بطن میں مختلف طبقوں کی ثقافتیں ضرور موجود ہوں گی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک قوم کے بطن میں مختلف طبقے اور مختلف گروہ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم قومی وحدت کا انکار کرتے ہیں اور قومی وحدت کے اصرار کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیں کہ ایک بلوچی زبان ہے ایک سندھی زبان ہے ایک پشتو زبان ہے، ایک پنجابی زبان ہے، گجراتی زبان ہے اردو زبان ہے۔ ان تمام علاقوں کے جغرافیائی حالات، تاریخ اور رسم و رواج میں فرق ہونے کی وجہ سے ان کی ثقافتوں میں بھی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ان حقائق سے انکار کر دیں تو لازماً ہم ان تعصبات کو ہوا دیں گے جن کے نتیجے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور سرحدی تو ٹھیک ہے لیکن پاکستانی کوئی چیز نہیں۔ وحدت کے نام پر ہم انتشار اور اختلاف کو دعوت دیتے ہیں۔

اگر ہم یہ کہیں کہ صرف یہی وحدتیں ہیں، یہی حقیقتیں ہیں اور ملک اور قوم کوئی چیز نہیں تو وہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم سب لوگ ایک جگہ رہتے ہیں، اگر ایک ملک کے باشندے ہیں، اگر ایک قوم کے افراد ہیں تو لازمی طور پر اشتراک کی کوئی نہ کوئی صورت تو ہو گی۔ اگر ہم ایک قوم ہیں —— جو کہ ہیں —— اور یہ ایک ملک و وطن ہے —— جو کہ ضرور ہے —— تو یہ بات واضح ہے کہ متذکرہ اختلاف کے باوجود اشتراک کے اتنے عناصر موجود ہیں کہ اس اشتراک کی وجہ ہی سے ہم میں وحدت کی یہ موجودہ صورت پیدا ہوئی ہے بعض لوگ اختلاف کو مخالفت سمجھ لیتے ہیں، فرق کو تضاد قرار دے لیتے ہیں اور اسی سے ایک قسم کی ذہنی الجھن ہوتی ہے۔ پنجابی اور بلوچ میں یا سندھی اور پٹھان میں جو فرق ہے وہ فرق ہے نہ کہ تضاد۔ اور جو اختلاف بلوچی کلچر اور پنجابی کلچر میں یا پٹھان کلچر اور سندھی کلچر میں ہے وہ اختلاف ہے مخالفت نہیں ہے۔

یہ بات تسلیم کر لینی چاہیئے کہ اختلاف موجود ہے، فرق موجود ہے۔ البتہ تسلیم کرنے کے بعد ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ مشترک عناصر کون سے ہیں اور وہ مشترک اجزاء کون سے ہیں

جن کو تقویت پہنچا کر ہم وحدت کو فروغ دے سکتے ہیں اور انتشار کو روک سکتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارے قصّے پیدا کیوں ہوتے ؟ پاکستانی ثقافت کے سلسلے میں ہمارے ذہن میں جتنے جالے ہیں ان کو صاف کرنا ضروری ہے۔

(۱) یہ جالا صاف کیا جائے کہ کلچر محض عیاشی اور لہو و لعب ہے۔

(۲) یہ جالا صاف کیا جائے کہ علاقائی ثقافت کا قومی ثقافت کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔

(۳) یہ جالا صاف کیا جائے کہ کلچر بہ حیثیت کلچر دین کے خلاف چیز ہے۔

(۴) یہ جالا صاف کیا جائے کہ طبقاتی کلچر کا قومی کلچر سے کوئی ٹکراؤ ہے۔

اپنے ذہن سے یہ سارے جالے صاف کرنے کے بعد ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ جھگڑے کی یہ باتیں آخر اٹھائیس انتیس سال سے کیوں جاری ہیں۔ آخر یہ جھگڑا ہے کیوں۔ ؟

میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں کوئی دوسرا ملک ایسا ہے جسے ایسی الجھن درپیش ہے جیسی کہ ہمیں۔ باقی تمام قوموں اور ملکوں کے پاس جو کچھ ہے اس کو وہ اپنا ورثہ سمجھتے ہیں۔ وہ ملک اسی کے مطابق اپنے کلچر کی تعریف کرتے ہیں اور اسی تعریف کی روشنی میں وہ اس کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر یہ قصّہ ہمیں ہی کیوں درپیش ہے۔ ؟

میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ ـــــ بنیادی وجہ ـــــ تو صرف وہ حالات ہیں جن میں پاکستان وجود میں آیا۔ آزادی سے پہلے کوئی پاکستانی قوم نہیں تھی اس لئے کہ پاکستان نام کا کوئی ملک ہی نہ تھا۔ اس وقت ایک طرف ہندی مسلمان تھے اور دوسری طرف غیر مسلم تھے اور اسی طرح وہ لوگ پہچانے جاتے تھے۔ تمام مسلمان کسی ایک علاقے میں نہیں بسے ہوتے تھے۔ سارے ہندوستان میں پھیلے ہوتے تھے جن میں پاکستان کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس وقت کے ہندوستان میں بسنے والے ایک اور طرح سے بھی پہچانے جاتے تھے یعنی مدراسی، بنگالی، بہاری، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو پاکستان کی جغرافیائی سرحدیں متعین ہو گئیں اس لئے کہ وہ علاقہ جو پاکستان کہلایا، وہ ریاست جس کا نام پاکستان ٹھہرا اس کا جغرافیائی وجود تسلیم ہو گیا۔ اس

کے بارے میں کسی کو شک و شبہ باقی نہیں رہا۔

لیکن ایک اور جو منزل تھی یعنی پاکستانی ثقافت، تو اس کے متعلق کسی نے فیصلہ نہیں کیا کہ اس منزل کے خدوخال کیا ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے۔ وضاحتیں کرتے سے ہم کتراتے رہے۔ سب سے پہلے آپ کو پاکستانی کلچر کی تعریف کرنی تھی۔ اسے متعین کرنا تھا جو نہیں کیا۔

ہر کلچر کی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کو میں اس طرح سمجھانے کی کوشش کروں گا، کوئی ایک چیز لے لیجئے، اس کا طول ہے، عرض ہے اور اس کی گہرائی یا ضخامت ہے۔

تاریخ کو آپ اپنے کلچر کا طول کہہ لیجئے۔ طے یہ کرنا ہے کہ آپ اپنی تاریخ کہاں سے شروع کرتے ہیں۔ جغرافیائی حدود کو عرض کہہ لیجئے۔ یہاں کوئی الجھن نہیں کیونکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حدود طے ہو گئیں۔ گہرائی یا ضخامت سے مراد یہ ہے کہ آپ کے کلچر کی عوام میں رسائی کہاں تک ہے۔

جب پاکستانی کلچر کا سوال پیدا ہوا تو سب سے پہلے ہم یہ سوچنے لگے کہ اس کی تاریخ کہاں سے شروع کریں۔ ہے موہنجوڈارو سے شروع کریں کہ ٹیکسلا اور کندھار سے۔ محمد بن قاسم سے شروع کریں کہ سرسید احمد خان سے۔ قراردادِ پاکستان سے شروع کریں یا ۱۹۴۷ء سے۔ ہم اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتے تھے اس لئے اس سے ابھی تک اغماض کرتے رہے۔ ہم نے اس سوال کا کبھی جواب دیا ہی نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جواب بالکل صاف ہے۔

اب دوسری بات جغرافیہ کی۔ ہمارے کلچر کا جغرافیہ کیا ہے۔ ہے ہمارے کلچر میں جو چیزیں شامل ہیں ان میں زبان بھی ہے۔ اردو زبان کو لیجئے۔ اس کا جغرافیہ تو پاکستان تک محدود نہیں۔

وہ تو ہندوستان میں بڑی آبادی اور وسیع علاقے کی بنا پر زیادہ بولی جاتی ہے۔ یہاں کم لوگوں کی زبان ہے۔ یا ہمارا جو دوسرا پرانا تاریخی ورثہ ہے اس میں کچھ فارسی ہے اور یہ افغانستان اور ایران سے جا ملتا ہے۔ اردو کا رشتہ ایک طرف جا ملتا ہے، فارسی کا دوسری طرف۔ ہماری کلاسیکی موسیقی وہی ہے جو ہندوستان میں بھی ہے۔ اس پر حد کیسے لگائی جاتے ہے چنانچہ ہم عرض کا بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ اس کی جغرافیائی حدود بہ اعتبار کلچر کیا ہیں۔

تیسرا مسئلہ اس کی گہرائی یا ضخامت کا ہے۔ یعنی کلچر کا اثر کہاں تک ہے۔ قومی کلچر ملک کے کس کس طبقے تک پہنچا ہے۔ وہی وقت پیش آگئی کہ سرحد کا کلچر الگ ہے، سندھ کا الگ، بلوچستان

کا الگ اور پنجاب کا الگ۔

ہم نے کسی بات کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ ہر بات کا کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ایسا نکلتا تھا جس کا بالکل سیدھے طریقے سے سامنا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ قومی ثقافت میں ہر وہ چیز شامل ہے جو کسی سرزمین میں موجود ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس سرزمین کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس وقت سے لے کر اس وقت تک جو علوم و فنون اور جو کچھ اس ملک میں ثقافت کی صورت میں موجود ہے اس ملک کا ہے اور اس قوم کا ہے وہ اس کا سرمایہ ہے اس کا اثاثہ ہے، اور اس سے کسی طریقے سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے پھر میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ اس ملک میں ہے وہ ہمارا ہے۔ اگر کلاسیکی موسیقی ہندوستان میں بھی ہے تو رہے۔ جو ہماری کلاسیکی موسیقی ہے وہ ہماری ہے، وہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ پشتو افغانستان میں بھی بولی جاتی ہے تو بولی جائے ہم اپنی پشتو سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہندوستان کی بہت بڑی آبادی اردو بولتی ہے تو بولے ہم اردو کو رد تو نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تو سیدھی بات ہے کہ کلچر کی حدود اور ریاست یا سیاست کے حدود ایک نہیں ہوتے۔

یورپ کی مثال لیجئے۔ یورپی اقوام متحدہ یونانی مجسمے اور یونانی اصنام اب تک استعمال کرتی ہیں۔ ایسے ملک بھی ہیں جہاں ایک نہیں تین چار اور پانچ قومیں آباد ہیں۔ وہاں کسی کو کوئی الجھن درپیش نہیں۔ انگلستان کے کسی شاعر نے شعر کی فکر یا تخلیق کے وقت یہ نہیں سوچا کہ میں کیوپڈ یا ایفروڈائٹی کا ذکر کیوں کر رہا ہوں؟ وہ نہ انگریز تھے اور نہ عیسائی پھر میرے اشعار میں ان کا ذکر کیوں آتا ہے۔؟

ہم اپنے کلچر کو چھوئی موئی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کسی کا ہاتھ لگ گیا تو خراب، کسی کی ٹانگ ٹکرا گئی تو گڑبڑ یا یہ کہ اس کا فلاں حصہ ہمارا نہیں ہے تو اسے دے دو یا یہ حصہ فلاں کا ہے اسی کے پاس رہنے دو وغیرہ، تو یہ بات میرے خیال میں ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے اور جتنا بھی تاریخی ورثہ ہے ہمیں اس سب پر فخر کرنا چاہیئے۔ اس تفاخر میں وہ حصہ جو محض تاریخی ہے اسے آپ محض تفاخر کے لئے استعمال کیجئے۔ یعنی یہ کہ موہنجوڈارو کا ہماری موجودہ زندگی سے بہت کم علاقہ ہے۔ لیکن اس کے کچھ حصے ایسے ہیں جو اب بھی آپ کو سندھ کے ظروف میں سندھ کے

لباس میں ملیں گے۔ بقیہ کا آج کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ کندھارا آرٹ دنیا کا عظیم جمالیاتی ورثہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا بھی ہماری موجودہ زندگی سے بہت کم تعلق ہے لیکن اس کا ایک آدھ عنصر ظروف لباس یا تعمیرات میں زندہ نظر آتا ہے۔

تاریخی ورثے کا جو حصّہ محض قومی تفاخر کے کام آئے اسے تو رکھئے نمائش گاہ میں، عجائب گھر میں، اس پر فخر کیجئے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو عناصر زندہ اور ہماری روایات کا حصّہ ہیں ان کے بارے میں یہ سوچنا چھوڑ دیجئے کہ یہ ہندوستان میں بھی ہے۔ یہ سوچنا بھی چھوڑ دیجئے کہ اگر وہ آپ کے دین سے متصادم نہیں ہے تو یہ اسلامی نہیں ہے اس لئے ہمارا نہیں ہے۔ پنجابی زبان اسلامی نہیں ہے۔ لسّی پینے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ایک طرح کے کپڑے پہنے ہیں اور آپ نے دوسری طرح کے اس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب دنیوی چیزیں ہیں ان کو دنیوی سمجھ کر قبول کر لیجئے۔ یہ وہ دوسرا مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہمارے ذہن کا جالا صاف ہونا چاہیئے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کاروبارِ زندگی میں ہم نے اپنی قومی ضرورت کی جو درجہ بندیاں کر رکھی ہیں ان میں اپنی ثقافت اور قومی کلچر کو کیا مقام دیتے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ نہ صرف ضروری چیز ہے بلکہ قومی زندگی کی اولیّں ضروریات میں سے ایک ہے۔ نہریں کھودنے، کارخانے بنانے یا بنکوں کی عمارتیں تعمیر کرنے کے مقابلے میں کلچر کے ساتھ کیا ترجیحی سلوک کیا جائے، یہ نظریاتی بات ہے اس پہ بحث کا یہ وقت نہیں۔ اس سے آگے کی منزل ہے عملی نتائج۔ اس کے بارے میں بہت سی تجاویز رپورٹ کی صورت میں پیش کی جا چکی ہیں۔

عبدالحفیظ کاردار صاحب کی رپورٹ بنیادی طور پر دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلی تقسیم میں فنون یا فنونِ جمیلہ آتے ہیں۔ یہاں تھوڑے سے گریز کی اجازت چاہتا ہوں! یہ کہ فنونِ جمیلہ پر یاد آیا کہ فنونِ جمیلہ یعنی فائن آرٹس اور حرفت میں جو تمیز کی جاتی ہے وہ خالص مغربی چیز ہے۔ اور میں اس کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ ہاں تو فنون یا آرٹس کے بارے میں ہم مل جل کر عملی تجاویز تیار کر سکتے ہیں کہ تربیت گاہیں ہونی چاہئیں، ان کی درس گاہیں زیادہ ہوں، آرٹ گیلریاں بنائی جائیں۔ آرٹسٹوں کو آج کل رنگ کینوس برش وغیرہ نہیں ملتے وہ فراہم کرنے چاہئیں۔

موسیقاروں کے روزگار کا بہتر انتظام ہونا چاہیئے۔ موسیقی کی زیادہ محفلیں ہوں، ان محفلوں کے لئے زیادہ اور موزوں ہال بنوائے جائیں تاکہ ہمارے موسیقاروں کا فن لوگوں تک پہنچے۔ یہ جو عملی مسائل ہیں ان پر تفصیلی طور سے بحث بھی ہو چکی ہے۔ اور دستاویزی صورت میں حکومت کے پاس موجود بھی ہیں، صرف یہ فیصلہ ہو جائے کہ یہ عیاشی کا سامان ہے کہ نہیں۔ یہ ضروری چیز ہے کہ نہیں۔ جب یہ یقین ہو جائے تو پھر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اگر کسی شہر میں ایک داروغہ صفائی رکھ سکتے ہیں، ایک کوتوال شہر رکھ سکتے ہیں، ایک محرر چونگی رکھ سکتے ہیں اور باقی ہر طرح کا کوئی نہ کوئی آدمی رکھ سکتے ہیں تو آپ ایک ثقافتی افسر کیوں نہیں رکھ سکتے جو اس جگہ ثقافت کا انتظام کر سکے۔

بات صرف لاہور اور کراچی کی نہیں ہے۔ گوجرانوالہ، وزیر آباد، سیالکوٹ اور ـــــ جو دوسرے چھوٹے بڑے شہر گاؤں اور قصبے ہیں، وہاں ہر طرح کے کارندے موجود ہیں تو ایک کارندہ ایسا بھی رکھا جا سکتا ہے جو تلاش کرے کہ وہاں کس کے پاس نہر ہے، کوئی خاص فن ہے۔ لوگوں سے انہیں روشناس کرانے کی کوشش کرے تاکہ ان ہنرمندوں اور فن کاروں کو واقعی اشتیاق پیدا ہو اور وہ اپنے اپنے میدان میں جولانی طبع دکھائیں۔

اسی طرح اگر آپ نے نصاب تعلیم میں ہزار طرح کے مضامین شامل کر رکھے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ثقافت کو آپ پہلی جماعت سے لے کر آخر تک شامل نصاب نہ کر سکیں۔ میں پھر ایک بار عرض کروں گا کہ میرے بیان کردہ مسائل کو حل کرنا یا اس کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرنا کچھ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔

کلچر کا ایک اور مسئلہ معاشرے کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کا ہے۔ آپ کلچر کی صورت اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ آپ معاشرے میں ترمیم نہ کریں۔ شہروں اور دیہات کی، امراء اور غرباء کی، مزارع اور زمینداروں کی، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی، جو تقسیم اور ان کے جو طبقاتی تعلقات ہیں جب تک ان میں کوئی ترمیم نہیں کرتے اس وقت تک آپ بنیادی طور پر معاشرے کے اجتماعی کلچر کو تبدیل نہیں کر سکتے۔

سیاست میں ہمارا دخل نہیں ہے۔ سیاسی مسائل کے حل بھی سیاسی ہوں گے۔ اس

موضوع پر میں اس وقت گفتگو نہیں کروں گا کیونکہ یہ لمبی بات ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ اوّل تو ہم قومی سطح پر پاکستانی قومیّت اور پاکستانی ثقافت سے شرمانا چھوڑ دیں۔ دوم یہ کہ ہم اسے لہو و لعب یا لادینی سمجھنے کی بجائے اپنی زندگی کا ایک جزوِ اکبر قرار دیں۔ سوم یہ کہ جب اوّل اور دوم سے ہم متفق ہیں تو پھر اپنی قومی زندگی میں اس کے ترجیحی مقام کا تعیّن اور اسی کے مطابق منصوبہ بندی کریں۔ آخر میں یہ کہ آرٹ اور کلچر تو کرنے کی چیزیں ہیں۔ اس کے بارے میں ہم باتیں کم اور کام زیادہ کریں۔

سوال :۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہاں تھیٹر کی روایت کم تھی، مصوّری کی روایت تھی، کلاسیکی موسیقی بہت بڑی روایت کی صورت میں ہمیں ورثے میں ملی۔ یہ کیا وجہ ہے کہ تھیٹر کو ترقی ہوئی مصوّری کو ترقی ہوئی مگر موسیقی رو بہ منزل ہے اور یہ بھی کہ ہمارے مصوّر مغربی انداز کی تصویریں بنانے لگے ہیں۔

جواب :۔ میرا خیال ہے کہ آپ لاہور کی وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں تھیٹر کو ترقی ہوئی۔ تھیٹر کو کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ آج سے کوئی چالیس پینتالیس برس پہلے ہماری طالب علمی کے زمانے میں لاہور میں ایک بہت ترقی یافتہ تھیٹر موجود تھا لیکن جب ٹاکیز شروع ہوئیں تو اس کا وجود ختم ہو گیا۔ شوقین نوجوان جو آج کل ڈرامے کرتے رہتے ہیں تو اس کی ابتدا۔ بس کوئی پندرہ سترہ سال پہلے ہوئی اور یہ سلسلہ بھی ہم نے یہیں شروع کیا تھا۔ اگر آپ اس نقطۂ نگاہ سے ترقی کہہ رہے ہیں تو پھر میں اتفاق کروں گا۔

جہاں تک مصوّری کا تعلق ہے آپ فرما رہے ہیں کہ ہماری قدیم مصوّری کو فروغ نہیں ہوا، مغربی مصوّری کو ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہماری قدیم طرز کی مصوّری کے قدردان ایک خاص طرح کے لوگ تھے اور ان کی وجہ سے دیسی تصویریں بنائی جاتی تھیں یعنی منی ایچر پینٹنگس۔ ان میں دو طرح کے مضامین ہوتے تھے۔ یا تو مرقعے ہوتے یا پورٹریٹ یعنی شبیہ۔ مذہبی مضامین یا افسانوی مضامین کی تصویر کشی کی جاتی تھی یا نوابوں وغیرہ کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ جب خاص قسم کے قدردان کم ہو گئے یا نوابوں کا طبقہ ختم ہو گیا تو مصوّری کی یہ صورت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد لازم تھا کہ کوئی نئی صورت پیدا ہو۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انگریزوں کی حکومت

کی وجہ سے فن مصوری کو ترقی نہیں ہوئی اس متذکرہ نئی صورت کی خاطر ہمارے نوجوانوں کو مغرب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اگر ہم مصوری کی کوئی اپنی مخصوص روش اختیار نہیں کریں گے تو ہم مغرب ہی کی نقل کرتے رہیں گے۔

رہا موسیقی کا سوال تو بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک خاص طرح کا تعصب پیدا ہوا جس کا تعلق موسیقی سے نہیں تھا بلکہ اس طبقے سے تھا یا موسیقی کی اس صورت سے تھا جو خاندانِ مغلیہ کے زوال کے وقت برصغیر میں پیدا ہوئی۔ بالکل آخری دور میں یہ فن، چند ایک بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں چلا گیا جو معاشرتی اعتبار سے کوئی موقر طبقہ نہیں تھا اس لئے موسیقی سنجیدہ لوگوں کے لئے زیادہ پسندیدہ نہ رہی۔ اس کے بعد جب انگریز آئے تو انہوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ چنانچہ موسیقی نام ٹھہرا مجرے کا، گھٹیا قسم کی عیاشی کا، دل لگی کا۔

اس کے بارے میں ہمارا نظریہ صحیح ہو جانا چاہیئے تھا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم یہ سوچیں اور سمجھیں کہ موسیقی ایک نہایت سنجیدہ، شائستہ اور موقر فن ہے۔ اگر اس فن کو بعض پیشہ ور لوگوں نے اور ایسے لوگوں نے جو اس کی خوبی و نفاست سے واقف نہیں تھے بدنام کیا ہے تو طویلے کی بلا بندر کے سر نہیں جانی چاہیئے۔

سوال:۔ اگر ہم کلچر کی تعریف کر لیں تو ہم اپنی قومی شناخت کو سامنے لا سکتے ہیں اور اس کو فروغ دے سکتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہیں ہو سکتیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علاقائی کلچروں میں تضاد نہیں فرق ہے۔ اس فرق کو تضاد میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے اس کا آپ کے پاس کیا حل ہے۔؟

جواب:۔ ایسا کوئی نسخہ یا حل تو ہے نہیں کہ کچھ حصہ پشتو کا اور کچھ بلوچی کا اور تھوڑا سا سندھی یا پنجابی کا ملا دیں۔ یہ تو ایک ارتقائی چیز ہے۔ پہلے ایک اصول طے کر لیا جائے، کوئی راستہ متعین کر لیا جائے، ایک سمت سوچ لی جائے اس کے بعد آگے بڑھیں۔ مثال کے طور پر سندھ میں کسی نے لال شہباز قلندر گا لیا تھا۔ اور دیکھیئے اب وہ پورے پاکستان کا مقبول گیت ہو گیا ہے۔ پاکستان ہی نہیں اس کے باہر آسٹریلیا تک میں گایا جاتا ہے۔ بلوچستان سے کوئی بڑا فن کار آتا ہے، مثال کے طور پر فیض بلوچ آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسی شہر کا

کوئی فن کار ہے۔ اسی طریقے سے یہاں کا کوئی اچھا فن کار جیسے امانت علی خاں یا شریف پونچھ والے یا عوامی فن کاروں میں سے عالم لوہار یا سائیں اختر حسین دوسری جگہوں پر جا کر گائیں گے تو وہاں کے لوگ سنیں گے لطف اندوز اور واقف ہوں گے۔

ایک ترکیب تو یہ ہے کہ ہمارے فن کی جو مختلف صورتیں ہیں انہیں جگہ جگہ اور ایک دوسرے سے روشناس کرانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشترکہ اجزاء کو تحقیقی انداز میں تلاش کر کے شعوری طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اہلِ فکر اصحاب کو آمادہ کیا جائے کہ وہ کلچر کے سلسلے میں کسی نقطۂ نظر پر متفق ہو جائیں تاکہ ان کے توسط سے اور ان کی وجہ سے یہ متفقہ نقطۂ نظر دوسروں تک پہنچے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کوششوں کے مفید نتائج کچھ عرصے کے بعد آپ کے سامنے ضرور آجائیں گے۔

سوال:۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ہمیں حال کے کلچر کو فروغ دینا چاہیئے۔ حال کے کلچر میں ایسے عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں جن کو بیرونی کہا جاتا ہے۔ اور جن کا تعلق سرمایہ دار ملکوں سے ہے، یہ جو ہپی ہیں انہیں خاص طور پر اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ تیسری دنیا کے لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں، کام کرنا چھوڑ دیں۔ کیا اس بیرونی کلچر کے اثر کو روکا جا سکتا ہے۔؟

جواب:۔ مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے اور آپ نے جو کچھ کہا صحیح ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بیرونی اثرات کا نفوذ کیوں بڑھ رہا ہے۔ یہ اس لئے بڑھ رہا ہے کہ ہم نے اپنی ثقافت اور فن کو کوئی مقام ہی نہیں دیا۔ اگر ہم نے یہ قبول کیا ہوتا کہ یہ ہمارا فن ہے یہ ہماری ثقافت ہے اور اسے ہم نے معتبر طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہوتا تو لازمی طور پر ان بیرونی اثرات کا زور اتنا نہ بڑھتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ جو نفوذ ہے جو دراصل ایک قسم کی یلغار ہے ایک طرح کا حملہ ہے اس کی جارحیت کو کم کیا جائے تو ہم کوئی متبادل صورت پیدا کریں۔

سوال:۔ کلچر کسی قوم کا رویہ ہوتا ہے اور ایک مسلسل عمل ہوتا ہے۔ جیسے دریا بہتا جاتا ہے اسی طرح ثقافت بہتی جاتی ہے۔ کلچر کو فروغ دینا مجھے بہت مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی

ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے پاس کبھی کوئی ثقافت تھی ہی نہیں اور ہم نے اچانک کوئی چیز دریافت کر لی ہے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ کہنا درست ہے کہ ہم اپنے کلچر کو فروغ دیں یا یہ کہ جو کلچر ہمارا تھا اس کی ہم کسی طرح نشاندہی کر سکیں اور کہیں کہ اس کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر فروغ دینے سے یہی مطلب ہے تو میرا سوال بے کار ہے اور اگر فروغ دینے سے یہ مطلب ہے کہ ہم شعوری طور پر کوشش کریں اور کوئی کلچر اپنا بنائیں تو یہ بات مجھے بالکل غلط لگتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔؟

جواب:۔ میں نے کلچر کے دو اجزاء بیان کئے تھے۔ دو پہلو۔ ایک تو وہ ہے جسے ہم فنون یا آرٹس کہتے ہیں۔ یہ ایسی چیز ہے جسے ہم فروغ دے سکتے ہیں۔ یہ بالکل ارادی چیز ہے اور افراد کی پیدا کردہ۔ اگر انہیں فروغ دینے کی کوشش نہ کی گئی تو یہ ختم ہو جاتے ہیں یا ان میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کلچر کا بہت ضروری حصّہ ہے اسے فروغ دینا پڑتا ہے اور فروغ دینا چاہیئے۔ فروغ کے لئے نئی صورتیں وضع کرنا پڑیں گی اور موجودہ صورتوں میں ترمیم بھی کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے بعض پرانی صورتیں دوبارہ رائج بھی کرنی پڑیں۔

کلچر کا دوسرا جزو وہ ہے جسے آپ رویّہ کہتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں طرزِ زندگی جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ طرز یا رویّہ تو معاشرے کی پوری اجتماعی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جیسے جیسے معاشرے کی زندگی بدلے گی ویسے ویسے اس کی صورت بھی بدلے گی۔ اس کو آپ بدلنا چاہیں تو آپ کو معاشرے کی صورت بدلنی ہوگی۔ آپ کسی اور طریقے سے تبدیلی نہیں لا سکتے اور ترمیم یا تنسیخ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمیں اپنے کلچر کو فروغ دینا ہے تو اس کے لئے تو آپ کو اپنے معاشرے کو فروغ دینا ہوگا۔ معاشرے میں جو خرابیاں ہیں انہیں دور کیجئے اس کے بعد وہ پریشاں خیالی جو کلچر کے تعلق سے ہے خود بخود دور ہو جائے گی۔ البتہ فنون کا مسئلہ مختلف ہے۔ اسے آپ شعوری طور پر فروغ بھی دے سکتے ہیں اور اس کی صورتیں تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔

سوال:۔ ہمارے ہاں تہذیب اور ثقافت کو کلچر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کے ایک مضمون کا عنوان بھی ایسا ہی تھا اور آج کا موضوع بھی ایسا ہی ہے۔ یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔؟

جواب :۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب اور کلچر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ تہذیب کلچر کی ظاہری صورت ہے۔ زندگی کا روزمرہ، مختلف صورتوں میں اس کا اظہار، جیسے فنونِ لطیفہ، مختلف علوم وغیرہ تو ان سب کی متشکل صورت کو میں تہذیب کہتا اور سمجھتا ہوں۔ میں تہذیب کو کلچر ہی کے معنوں میں استعمال کرتا ہوں کیونکہ دونوں میں مجھے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ کلچر کو اگر طرزِ زندگی کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو تمدن کہنا چاہیئے، لیکن یہ تو محض الفاظ کی بحث ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اگر ہم کلچر اور تہذیب کو الگ کرنا چاہیں تو سمجھ لیجئے کلچر طرزِ زندگی کا نام ہے اور اس کی جو متشکل صورتیں ہیں ان کو ہم تہذیب کہیں گے۔

سوال :۔ آپ نے حکومت کی یہ کوتاہی بیان کی ہے کہ اس نے ثقافت کو وہ درجہ نہیں دیا جو اسے ملنا چاہیئے تھا۔ مثال کے طور پر نصاب میں ثقافت پر کوئی مضمون شامل نہیں یا ثقافت کی وزارت الگ سے نہیں یا افسرِ ثقافت مقرر نہیں کئے جاتے۔ آپ کے خیال میں حکومت کو کہاں تک مداخلت کرنی چاہیئے کیونکہ حکومت تو بالآخر کسی نہ کسی سیاسی جماعت ہی کی ہوتی ہے اور حکومتیں بدلتی رہتی ہیں

جواب :۔ اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جب یورپ میں جاگیرداری نظام کو زوال ہوا تو جو لوگ کلچر کے مربی اور سرپرست تھے ان کا بھی زوال ہوا۔ ان کی جگہ ایک اور طبقے نے لی جس کو سرمایہ دار طبقہ کہتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے فن کی قدردانی شروع کی اور اسی لئے یورپ کی حکومتوں کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک سے ایک صاحبِ ثروت پیدا ہوا۔ ان لوگوں نے تھیٹر بنائے، گیلریاں بنوائیں، آرٹسٹوں کے مال کو مالِ تجارت بنا دیا اور بیچنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ جاگیرداری کے آرٹ کی جگہ ایک نیا آرٹ پیدا ہوا اور اس نئے آرٹ کے ساتھ نئے نئے قدردان بھی۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کا پرانا طبقہ یعنی جاگیردار، قدرداں اور مربی وہ جب ختم ہوئے تو ان کی جگہ سرمایہ دار پیدا نہیں ہوئے انگریز پیدا ہوئے۔ میرا مطلب ہے انگریزوں کی حکمرانی سے۔ انگریزوں نے کہا یہ تمہارا آرٹ کلچر سب بکواس ہے۔ سارا آرٹ اور کلچر تو ہمارے پاس ہے۔ اس لئے اپنا سب کچھ بھول جاؤ اور ہمارا کلچر سیکھو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سو ڈیڑھ سو سال میں ہمارے

ہمارے پاس جو کچھ تھا ضائع ہو گیا۔ بالکل تباہ۔ جب پاکستان بنا ہم انگریز کی حکمرانی سے آزاد ہوتے تو ایسا کوئی طبقہ ہمارے پاس موجود نہیں تھا۔ یہ ذمہ داری لازماً حکومتوں کی ہوگئی۔ مختلف حکومتیں ان ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہوتیں اس کا فیصلہ آپ خود کریں لیکن موجودہ صورتِ حال میں جب تک ہمارے عوام کے پاس آرٹ اور کلچر کو فروغ دینے اور اسے پرورش کے ذرائع اور وسائل نہیں ہیں اس وقت تک لازماً ہمیں حکومت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا اگر کوئی چارہ کار ہے تو مجھے بتائیے۔؟

سوال:۔ عوامی سطح پر بھی کام ہو سکتا ہے۔

جواب:۔ عوامی سطح پر ایک خاص حد تک ہی کام ہو سکتا ہے۔ اگر آپ ڈراما کرنا چاہیں تو تھیٹر کی ضرورت ہوگی۔ تھیٹر بنوانے کے لئے پیسے کون دے گا۔؟ اگر عوام پیسے دینے کو تیار ہیں تو ظاہر ہے حکومت کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن آپ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابھی تک عوام میں کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے جو اس کی کفالت کر سکے۔ یہ ایک عبوری دور ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب وسائل مہیا ہو جائیں گے تو عوام میں خود بخود ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو حکومت کی سرپرستی یا کفالت کے بغیر ایسے کام کر سکے۔ ترقی یافتہ ممالک کو دیکھئے۔ انگلستان۔ وہاں تھیٹر بھی موجود ہے اور پبلک بھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے برٹش آرٹ کونسل کا بجٹ کوئی دو کروڑ پونڈ ہے اس کے باوجود اسے حکومت سے امداد لینی پڑتی ہے۔ ایسے ثقافتی اداروں کو جو خود کفیل نہیں ہوتے حکومت سے مدد لینی ہی پڑتی ہے اور حکومت کو اپنی ذمہ داری سنبھالنی ہی پڑتی ہے۔ رہا حکومت کا پیسہ تو وہ بھی ہمارا ہی پیسہ ہے ان کا کہاں سے ہوا۔ اس لئے ہم یہ تفریق کیوں کرتے ہیں کہ پیسہ حکومت سے آیا ہے یا ہم نے جمع کیا ہے۔

سوال:۔ آپ نے اس الجھن کا ذکر کیا ہے کہ ہم ثقافت کا صحیح تشخص نہیں کر سکے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ مختلف حکومتوں نے مختلف نظریات کے پیشِ نظر ثقافت کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا پرچار کیا۔ مثال کے طور پر ایک حکومت نے کہا کہ اگر سندھی بلوچی ثقافت کو آپ فروغ دیں گے تو چار قومیتیں بن جائیں گی۔ دوسری حکومت نے کہا کہ نہیں ضرور فروغ دینا چاہیئے۔ اس تمام الجھن کا سبب آپ کی رائے میں یہ تو نہیں ہے کہ اس معاملے میں حکومتوں کا

راست عمل دخل رہا ہے۔؟

جواب :۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی حکومت کو اس طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی۔ بس سطحی باتیں رہیں الف سے لے کر ی تک۔ سارے مسئلے پر غور کرنے اور اس کے لئے کوئی طریقۂ کار وضع کرنے کے لئے پچھلی حکومتوں نے وقت ہی نہیں نکالا۔ پھر حکومتیں جلد از جلد بدلتی رہیں، افراتفری کا عالم رہا اس لئے قومی سطح پر کوئی ایسی پالیسی وضع نہیں ہوئی جس سے ہم تفصیلی طور پر کوئی راستہ متعین کر سکتے۔ میرے خیال میں بڑا سبب حکومت کے دخل کا نہیں بلکہ عدم توجہ کا ہے۔

سوال :۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ ہماری من حیث القوم خواہش ہے کہ ہمارا فن ہمارے نصب العین کو حاصل کرنے میں مدد دے۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا فنی کوششوں کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے یا دیا جانا چاہیئے کہ وہ ہمیں اپنے نظریے اور نصب العین کی طرف لے جائیں یا آپ کے خیال میں ہماری فنی کوششوں کو اس پر زور نہیں دینا چاہیئے۔

جواب :۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی نظریات یا نصب العین ہوتے ہیں ان پر تو فن اور ثقافت کو زور دینا اور اس کا اظہار کرنا ہی چاہیئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں نصب العین کو اتنا محدود نہیں کرنا چاہیئے کہ بہت سی چیزیں اس سے خارج ہو جائیں۔ اگر ہم کوئی بہت ہی محدود شکل اپنے سامنے رکھ لیں کہ یہ ہمارا نصب العین ہے اور ہر چیز پر وہ حدود عائد کرنے کی کوشش کریں تو وہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی، لیکن اگر ہم اسے پھیلا کر پوری زندگی کا نصب العین بنا لیں تو یقینی طور پر اس کا عکس ہمارے فن اور ثقافت میں ملے گا اور ملنا چاہیئے۔

سوال :۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اپنے آرٹ کے ذریعہ ایسی چیزیں پیدا کریں جنہیں قوم اچھا سمجھنے لگے۔ اور کن چیزوں کو اچھا سمجھے اس کے لئے ہمارے پاس گائیڈ لائن موجود ہے۔ قرآن کی گائیڈ لائن۔

جواب :۔ صحیح ہے۔ مجھے اتفاق ہے۔

سوال :۔ میری ایک بھتیجی ہے۔ ہم پیار سے اسے گوگی کہتے ہیں۔ برسوں کی بات ہے

وہ مجھ سے پوچھنے لگی میں جب بھی چھینکتی ہوں ایکس کیوز می کہتی ہوں اور تایا جان الحمدُ للہ کہتے ہیں۔ ان میں کون سی بات اچھی ہے، ان بچوں کو تو سرمایہ دار ممالک کے کلچر کی وجہ سے ایکس کیوز می ملا، بتائیے ہم الحمد للہ کو کون سے کھاتے میں ڈالیں۔ اب بھی اس خلا۔ کو محسوس کرتے رہیں یا اس کی کوئی چھان بین کریں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔؟

جواب:۔ ہم نے اپنے بچپن میں ایکس کیوز می نہیں سیکھا تھا۔ الحمد للہ ہی سیکھا تھا۔ یہ تو اب پندرہ بیس برس سے شروع ہوا ہے۔ اس وقت سے جب سے ایک نئی چیز پیدا ہوئی جسے انگلش میڈیم اسکول کہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہ چیز نہیں ہوتی تھی۔ ایک آدھ اسکول تھا۔ ایچی سن، سینٹ انتھونی وغیرہ لیکن شرفاء وہاں نہیں جاتے تھے۔ محلے کے اسکول میں پڑھتے تھے۔

سوال:۔ میرا مطلب ہے خلا۔ تو نہیں ہوا۔

جواب:۔ خلا۔ تو فطرت میں ہوتا ہی نہیں۔ کوئی نہ کوئی چیز جگہ پُر کرنے کے لئے آجاتی ہے۔ ہم نے اپنے پیالے کو پوری طرح بھرا نہیں ہے۔ جو اس میں کمی رہ گئی ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہوگئی ہیں۔ اگر ہم نے اپنا ثقافتی پیالہ پُر کر لیا ہوتا تو دوسری چیزوں کی ان میں گنجائش کم ہوتی۔ مغرب کی بعض چیزیں آپ کو اختیار کرنی پڑیں گی۔ ہمارے دوست انتظار حسین نے رونا رویا تھا کہ لوگ آبخورے اور صراحیوں کی جگہ ریفریجریٹر استعمال کرتے ہیں۔ اس حد تک اس کا کوئی علاج نہیں۔ اسی طرح ریڈیو ہے، ٹی وی ہے۔ یہ سب تو ہمیں قبول کرنا ہوگا لیکن جو ہمارا طریقِ فکر ہے، احساس ہے وہاں ہمیں ان کے اثرات کو ٹھونسنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بچنا لازم ہے کیونکہ اس طریقے سے ہماری قومی شخصیت اور انفرادیت کی نفی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے ذہن میں، ہماری شخصیت میں ایسے عناصر شامل ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی ہماری قومی زندگی کے لئے مفید نہیں ہیں۔ اب یہی بات کہ الحمد للہ کو رائج کیا جائے یا کسی اور صورت کو اور ایکس کیوز می سے چھٹکارا حاصل کیا جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ سارے انگلش میڈیم اسکول بند کر دیجئے۔ آپ اپنے طریقۂ تعلیم میں اس طرح ترمیم کیجئے کہ آپ کی روایتی کلاسیکی چیزوں کا دخل زیادہ ہو۔

سوال :۔ آپ نے اپنی تقریر میں چار قومیتوں کا یا چار کلچر کا ذکر کیا ہے۔؟

جواب :۔ میں نے چار کلچر کہا ہے چار قومیتیں تو نہیں کہا۔

سوال :۔ تو یہ جو چار کلچر ہیں ان کی بنیاد آپ نے انتظامی حد بندی کو بنایا ہے یا کچھ اور۔ کیونکہ اگر کوئی اور بنیاد ہے مثلاً لباس، زبان وغیرہ تو پھر وہ چار نہیں کئی ہیں۔

جواب :۔ ہاں کئی ہیں۔ میں نے چار کا نام تو مثال کے طور پر لیا ہے۔ پنجاب ہی کو لیجئے جب سے یہ قصہ پنجاب میں چلا ہے لوگوں نے علاقائیت کی تجارت شروع کر دی۔ اس وقت سے سرائیکی والے کہتے ہیں ہم تو پنجابی نہیں ہیں۔ ہمارا سرائیکی کلچر ہے۔ پوٹوہاری کہتے ہیں ہمارا کلچر الگ ہے۔ یہ سب تو وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایسی باتیں کہتے ہیں۔ مجھے اتفاق ہے کہ کلچر کی بہت سی صورتیں ہیں لیکن ایک جزک صورت بھی ہے۔ پنجاب کی جو ثقافتیں ہیں ان کی ایک صورت کو ہم پنجابی کہتے ہیں۔ اسی طرح سے سرحد بلوچستان اور سندھ میں جو مختلف صورتیں موجود ہیں ان کو ـــــ جیسا کہ میں نے جزک نام کہا ہے ـــــ پٹھان بلوچی یا سندھی کہتے ہیں۔ اور ان چاروں سے مل کر جو صورت پیدا ہوتی ہے اسے ہم پاکستانی کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہ صورتیں چار ہی ہیں۔ بکرانی ہیں۔ ان کا رقص، موسیقی اور زبان سب سے ایک حد تک الگ ہے۔ اسی طرح بروہی ہیں۔ میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ ان سب کو قبول کرتے ہوئے، انہیں تسلیم کرتے ہوئے ان کے مجموعے کو، ان کے گلدستے کو قائم اور منضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔

سوال :۔ نعرے کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے کہ فنون کو کسی نصب العین کی طرف رہنمائی کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا نصب العین کا ہم نے کوئی واضح تصور مرتب کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں کشمکش اور اختلافات ہیں۔ ہمارے دانشوروں کے درمیان بھی اور عوام کے ذہنوں میں بھی، فنونِ جمیلہ ہماری زندگی کا حصہ جو نہیں بن سکے اس کی وجہ ہمارا محدود نصب العین ہے۔ عوام کے ذہن میں کشمکش ہے کہ گانا بُری چیز ہے، ناچنا گناہ ہے وغیرہ۔ کیا اسی لئے کوئی حکومت آج تک کلچر کی حفاظت کے لئے کھل کر سامنے نہیں آئی۔ ؟

جواب :۔ میں نے یہی کہا تھا کہ ان الجھنوں کو صاف کئے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔ رہا

سوال نصب العین کا تو کسی ملک میں، پوری قوم میں سب لوگوں کا متفق الخیال ہونا تو مشکل ہوتا ہے۔ مختلف آراء ہوتی ہیں، مختلف مکاتبِ فکر ہوتے ہیں۔ البتہ اس بات پر ضرور اتفاق ہوتا ہے کہ ملک کی سالمیت اور بقاء لازم ہیں۔ جس حد تک اتفاق ہوتا ہے اور اس میں جو چیز معاون ثابت ہو اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ یہ بات کہ عوام کے ذہنوں میں کشمکش ہے، خواص میں اختلاف ہے کہ ہمارا نصب العین کیا ہے تو اس سلسلے میں چند ایک جو اختلافات ہیں ہمیں ان کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ان کے بارے میں لوگ بحث کریں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کریں جو اکثریت کو منوا لے گا وہ اقتدار میں آجائے گا اور جس کی بات نہیں مانی جائے گی وہ اپنی بات کہتا رہے گا۔ اسے کہنے دیجئے۔

سوال:۔ جہاں عقائد کی بنیاد پر اختلاف ہو وہاں تضاد ضروری ہے اور اس کلچر کو اپنانا بھی مشکل ہے۔

جواب:۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں بنیادی عقائد میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اگر ہیں تو وہ عملی مسائل سے متعلق ہیں اور وہ سیاست، معیشت یا معاشرے سے منسلک ہیں۔ بنیادی عقائد پر اختلاف نہیں ہے۔

سوال:۔ آپ نے کلچر کے ضمن میں زبان کا ذکر نہیں کیا۔

جواب:۔ میں نے زبان کو کلچر سے الگ نہیں کیا ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف زبانیں ہیں، سب ہماری زبانیں ہیں ان میں کوئی بدیسی زبان نہیں لیکن ان مختلف زبانوں کی موجودگی میں بھی ہمیں ایک زبان کی ضرورت ہے جو رابطے کا کام دے اور کاروباری زندگی میں سب کا یکساں وسیلہ بنے۔ وہ ایک ہی زبان ہے اور وہ ہے اردو۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں دوسری زبانوں کے بولنے والے حصہ بھی لے سکتے ہیں اور اظہارِ رائے اور اظہارِ خیال بھی کر سکتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں لڑائی شروع ہوتی ہے مقامی زبانوں کی، علاقائی زبانوں کی اور قومی زبان کی تو میں سمجھتا ہوں یہ بھی خود غرضانہ لڑائی ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ جو بھی زبانیں جہاں بولی جاتی ہیں ان کا فروغ لازم ہے، انہیں تسلیم کرنا لازم ہے۔ ان کے ساتھ ایک مشترکہ زبان کو تسلیم کرنا اور اسے فروغ

دینا بھی لازم ہے۔ ہم نے اپنے ذہنوں میں تضاد پیدا کر رکھا ہے اس کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

سوال:۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جس زبان کو آپ رابطے یا کاروباری زبان کہتے ہیں اب وہ زبان نہیں رہی جو کبھی اردوئے معلّٰی کہلاتی تھی۔ اب یہ ایک ایسی زبان ہے جو پاکستان کی مختلف ثقافتوں کی عکاسی کئے بغیر اور انہیں ساتھ لئے بغیر ہماری رابطے کی زبان نہیں بن سکتی۔ ہے

جواب:۔ زبان منجمد نہیں رہتی۔ اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ زبان تو ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ جوں جوں معاشرے کی ضرورتیں بدلتی ہیں زبانیں بھی بدلتی ہیں یا ان کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں جو اردو رائج ہے وہ اب اس ملک کی زبان ہے اور اس پر یہاں کی مختلف زبانوں اور بولیوں کا اثر پڑا ہے۔ اس وقت کسی دکاندار یا راہ گیر سے بات کیجئے وہ ٹیکسی کو ٹیکسی ہی کہے گا۔ اردو کا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کرے گا۔ ضرورت کے مطابق زبان میں الفاظ داخل ہوتے ہیں اور جن کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خارج ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح زبان کا لہجہ اور محاورہ ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آج دلّی میں جو اردو رائج ہے وہ اردوئے معلّٰی کہاں ہے۔؟ وہ غالب کے زمانے کی زبان تو نہیں ہے۔ غالب کے زمانے میں جو اردو تھی وہ غالب سے دو سو برس پہلے کی زبان تو نہیں تھی۔ جس طرح معاشرہ بدلتا ہے اظہار کی صورتیں بھی بدلتی ہیں۔

سوال:۔ علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو میں لانے سے کس نے روکا ہے۔؟

جواب:۔ کسی نے نہیں۔

سوال:۔ ہمیں ان الفاظ کو لانا چاہیئے۔؟

جواب:۔ لانے یا نہ لانے کا سوال نہیں ہے۔ وہ خود بخود آئیں گے۔ اگر آپ پشاور میں بیٹھ کر اردو میں بات کریں گے تو اردو میں کوئی نہ کوئی پشتو کا محاورہ اور مضمون آ ہی جائے گا۔

سوال :۔ ابھی ابھی بات ہو رہی تھی ہماری ثقافت پہ بیرونی اثرات کی۔ آج کل ایک اور فیشن چل نکلا ہے۔ معتبر اور ذمہ دار ثقافتی ادارے علاقائی رقص اس انداز سے پیش نہیں کرتے کہ وہ مجموعی طور سے پاکستانی معلوم ہو۔ وہ اس میں کچھ مغرب کا رنگ بھی ملا دیتے ہیں اس چیز کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے۔؟

جواب :۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے روایتی اور عوامی فن میں معاشرے کی تبدیلیوں کی طرح کچھ تبدیلیاں آئیں گی۔ جس زمانے میں یہ فن پیدا ہوا اس وقت معاشرے کی صورت کچھ تھی اب کچھ اور ہے۔ ان کا سلیقہ، ان کی ترتیب، ہیئت اور ان کا طریق اظہار اسی زمانے سے متعلق تھا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اس لئے اس فن کی صورت بھی بدل گئی ہے یا بدلے گی۔ ایک حد تک یہ عمل ناگزیر ہے۔ دوسرا پہلو ہے کسی چیز کو اس کے مزاج کے خلاف مسخ کر کے پیش کرنا۔ لوگ جس طرح دوسرے فنون کا منہ چڑاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز ماڈرن ہو گئی، میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ ہر فن کار اپنا مزاج ہوتا ہے اسے مسخ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں اسے زندہ رکھنے اور اس کو مزید توانائی بخشنے کے لئے ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ ہمیں کرنی پڑے گی۔

سوال :۔ آپ نے فنونِ جمیلہ کا ذکر کیا مگر ان کے معیار کے بارے میں کچھ نہیں کہا کہ ہماری فلم ٹیلی ویژن شاعری اور ادب کا معیار بلند ہو رہا ہے یا نہیں۔؟

جواب :۔ معیار کی بابت کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ اگر ایک اچھا شاعر پیدا ہوتا ہے تو دس خراب شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کس طرح فیصلہ کریں گے کہ ترقی ہوئی یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ایک اچھا شاعر پیدا کر لیں تو اس سے تلافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مصوری ہے دو اچھے مصور پیدا ہوئے تو بیس گھٹیا۔ مجموعی طور سے دیکھیں تو انحطاط ہی ہوا ہے اور ترقی ہی۔ کلاسیکی موسیقی کو لے لیجئے۔ ہمارے پانچ دس اچھے استاد رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ لینے والے پیدا نہیں ہوتے جو ایک لحاظ سے تنزل ہے لیکن اس کے مقابلے میں یہ دیکھئے کہ آج سے تیس سال پہلے سننے اور سمجھنے والوں کی جو تعداد تھی آج اس سے بہت زیادہ ہے اور اس اعتبار سے ترقی ہوئی ہے۔ سامعین میں ترقی ہوئی اور موسیقاروں میں کمی۔

سوال:۔ ہماری ثقافت میں جو چیزیں پانچ ہزار سال پرانی ہیں انہیں محفوظ کرنے کے لئے کیا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے دوسرے ثقافتی سرمائے کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے لئے کوئی بڑا اور مرکزی ادارہ بنایا جائے۔ کیا اس کے قیام کا کوئی امکان ہے۔؟

جواب:۔ آپ نے بجا فرمایا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام آباد میں ہم نے ایک ادارہ قائم کیا ہے لوک ورثے کی حفاظت کے لئے۔ اس کا ایک چھوٹا سا شعبہ لاہور میں بھی ہے جس کا تعلق کلاسیکی موسیقی سے ہے۔ مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ بدقسمتی سے ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بہت ہو گئی ہیں جس سے توانائی، محنت اور پیسے کا زیاں ہوتا ہے۔ ریڈیو بھی وہی کام کر رہا ہے جو ٹیلی ویژن کر رہا ہے۔ وزارتِ اطلاعات اور وزارتِ تعلیم میں بھی ایک ہی قسم کا کام ہے۔ تمام چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کو یکجا کر کے بہترین نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں اور یکجا کرنے سے وسائل کی کمی کی شکایت بھی دور ہو سکتی ہے۔ اگر صاحبِ ثروت اشتراک کریں تو یہ کام اور بہتر طریقے اور سہولت سے ہو سکتا ہے۔

ادراکِ فیض
سہ ماہی جریدہ، غالب جلد (۱) شمارہ (۲)
اپریل تا جون ۱۹۷۵ء ص ۹ تا ۱۳

کلچر ـــــ ایک گفتگو

ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی نشری تقریر یا گفتگو پر جامع، متوازن اور معقول بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو مسودے کی صورت میں سامنے ہو۔ نشری مقرر تیز رفتاری سے گفتگو کرتا ہے اور سامع کے لیے اس کے نشر کردہ نکات کو صحت کے ساتھ یاد رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے مذاکرے کے دوران میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے مگر لوگوں نے اُسے محض ایک مرتبہ سن کر اپنے اپنے تاثرات قائم کیے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ان باتوں سے نہیں ہے جو واقعی کہی گئی تھیں۔ کچھ اصحاب کے اپنے مفروضات ہیں جو انھوں نے پہلے سے بنا رکھے ہیں اور ان ہی مفروضات کے مطابق ان اصحاب نے اپنی اپنی تاویلیں گھڑ لی ہیں۔

میں سارے اخبارات بہت کم دیکھتا ہوں اور جو اخبارات نظر سے گزرتے ہیں ان کے سارے مضامین، مراسلات وغیرہ پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ جو کچھ میں اس دوران میں پڑھ سکا ہوں اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک آدھ بات جو مجھ سے منسوب کی گئی ہے وہ میں نے کہی نہیں۔ یا جس انداز سے وہ بات مجھ سے منسوب کی گئی اُس طریقے سے میں نے نہیں کہی۔ کچھ مغالطہ سماعت کے سقم نے پیدا کیا اور کچھ اس تعصب نے جس کو سند کا درجہ دینے کے لیے بعض لوگوں نے پہلے تو خود ہی اعتراضات وضع کیے اس کے

بعد اپنے ہی وضع کردہ اعتراضات کے جوابات دیے۔ ان سب کا میری تشریحی تقریر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے ٹیلی ویژن پر جن امور کی وضاحت کی کوشش کی تھی وہ یہ ہیں۔ کلچر یا ثقافت گانے بجانے یا لہو و لعب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قومی اور معاشرتی زندگی کا بہت ہی اہم شعبہ ہے۔ کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پورے طریقۂ زندگی کو کلچر کہتے ہیں جس میں سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے، عقائد اور اقدار کے ذریعہ بھی۔ زندگی کے آداب و رسوم سے اور زندگی کے روزمرہ کا جو محاورہ ہے اس کے ذریعہ بھی۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ فنون، ادب، موسیقی، مصوری، فلم وغیرہ اسی کلچر یا WAY OF LIFE کے ارادی، ترشے ہوئے اور منجھے ہوئے اجزاء ہوتے ہیں مگر ان دونوں کو یعنی کلچر اور فن کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ فن کلچر کا ایک مظہر ہوتا ہے اور کلچر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں پورا طریقۂ زندگی ہے۔

معاشرے کا جو ڈھانچہ ہوگا، اُس کی جیسی ہیئتِ ترکیبی ہوگی یا جیسا سوشیل اسٹرکچر ہوگا کلچر تمام تر اس کے تابع ہوگا۔ جیسے سیاسی یا معاشرتی حالات بدلتے ہیں اُسی کے مطابق کلچر کے تصورات اور اس کی اشکال بھی بدلتی رہتی ہیں یا بدلنی چاہئیں۔ کلچر نہ کوئی جامد شے ہے، نہ اُسے دوام حاصل ہے۔ ازل سے آج تک صدیوں کی اس دوڑ میں کتنے ہی کلچر پیدا ہوئے اور ختم ہوگئے یا اُن میں ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔ اسی باعث میں نے کہا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ کلچر کے تصورات اور اشکال میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت ایک نوع کی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اس میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اور اس کے مطابق ہمیں اپنے کلچر کا تصور قائم کرنا چاہیئے تھا جو اب تک ہم نے نہیں کیا۔

برصغیر کی تقسیم سے ایک نیا ملک وجود میں آیا۔ پاکستان۔ ایک نئی قوم وجود میں آئی ــــ پاکستانی قوم۔ پاکستان میں مختلف علاقے ہیں اور ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص زبان

اور مخصوص رسوم و رواج ہیں جو نہ تو کسی فیکٹری کے تیار کردہ مال کی طرح ہیں اور نہ کسی حکومت کے بنائے ہوئے قاعدے قانون کا نتیجہ۔ بلکہ تمام تر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں۔ مختلف علاقوں کی جب بات ہو تو ہمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن میں بہت سے بنیادی مشترک اجزاء ہیں جو ہمارے قومی کلچر کی اساس ہیں۔ اُن میں سب سے اہم عُنصر اشتراکِ دین ہے اس کے علاوہ بہت سے مشترک اجزاء کا ایک سبب جغرافیائی قربت ہے اور دوسرا سبب تاریخی تجربات۔

ملک کے دو یا دو سے زیادہ علاقوں کی تہذیبوں میں جو فرق ہے اُسے فرق سمجھنا چاہیے تضاد نہیں۔ اور ان میں اشتراک و یگانگت کی جتنی ممکن صورتیں ہیں ان پر توجہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ قومی یک جہتی ان اختلافات یا تفریقات کی نفی کرنے سے وجود میں نہیں آسکتی بلکہ ان کے اقرار کے بعد تمام مماثلات کو یکجا کرنے سے ہی ممکن ہے۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے اور نہ کبھی ایسا تھا جس میں اُس ملک کے تمام علاقوں کی تہذیب بالکل یکساں تھی اور ان میں کبھی کوئی فرق یا اختلاف نہیں تھا۔ کیا انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی تہذیبیں یکساں ہیں؟

اس اختلاف کے ذکر کو چار قومیتوں کا پرچار کہنا یا صوبائی تعصبات کا رنگ دینا قطعی غلط اور گمراہ کن ہے۔ یہ دراصل اصطلاحات کی بیکار سی جنگ ہے اور یہ اصطلاح ہم نے انگریزی زبان سے اپنی زبان میں منتقل کی ہے جس کی وجہ سے اس کے معنی و مفہوم میں بہت سے مغالطے پیدا ہو رہے ہیں۔

انگریزی میں نیشن نیلٹی کا جو مفہوم ہے میرے خیال میں اردو کے قومیت کے مفہوم سے اس لیے مختلف ہے کہ ہماری زبان اور ہماری قوم کا مزاج بالکل الگ ہے اور جو لسانی اعتبار سے صحیح ترجمہ ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے میں قابلِ قبول نہیں ہے اور اسی لیے اصطلاحات کی یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔

پرانی تاریخوں میں ایک شخص کا نام ملتا ہے۔ ہیمو۔ جس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ "قوم کا بقال" تھا۔ مضامین میں آپ کو لکھا ہوا ملے گا کہ فلاں شخص "قوم کا بنیا تھا"۔ بقال اور بنیا تو کوئی قوم نہیں مگر اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محض ایک لفظ یا کسی غیر زبان کے لفظ

کے ترجمے سے کتنی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ میں پھر ایک بار کہوں گا کہ یہ محض اصطلاح کی جنگ ہے جو قومی یک جہتی کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

ٹیلی ویژن پر دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ کلچر اور ریاست کے حدود عام طور سے یکساں نہیں ہوتے۔ وسط ایشیا میں کئی ممالک ہیں جو عرب و عجم کی تہذیب کے زیر اثر ہیں۔ یورپ کے کئی ممالک پر یونان و روما کی کلاسیکی تہذیب کا اثر ہے۔ یہی صورت پاکستان کی ہے۔ بلاشبہ ہمارے تہذیبی ورثے میں دہلی و آگرہ اور میر و غالب بھی شامل ہیں۔ اسی طرح سمرقند و بخارا اور حافظ سعدی اور رومی بھی شامل ہیں۔ لیکن تھوڑی سی تفریق بھی لازم ہے اُن تہذیبی مظاہر و آثار میں جو اس وقت ہماری سرزمین میں موجود ہیں اور اُن مظاہر و آثار میں جو اس سرزمین کے باہر ہیں۔

یورپ کی مثال لیجیے۔ سارے یورپی ممالک یونان و روما کی تہذیب و فنون کو اپنا ورثہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود فرانس و برطانیہ کی تہذیب ایک نہیں ہے۔ جرمنی و ہالینڈ کا کلچر ایک نہیں ہے۔ ان ملکوں کے لوگ جب اپنے قومی افتخار کی بات کرتے ہیں تو انگریز شیکسپیئر پر فخر کرتا ہے ہومر پر نہیں۔ جرمن گوئٹے پر ناز کرتے ہیں اور فرانسیسی وکٹر ہیوگو پر۔ ان اقوام کے پیش نظر اپنا ادب اور اپنا فن پہلے ہوتا ہے۔

اسی طریقے سے پاکستان بننے کے بعد ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس سرزمین سے جو کچھ متعلق ہے یعنی یہاں کے آثار، علوم و فنون وغیرہ ان پر ہم فخر کرنا سیکھیں۔ اس اعتبار سے ہمارے بنیادی خیالات میں ایک ترمیم کی ضرورت ہے جو یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ غیر منقسم ہندوستان کا معاشرہ نہیں ہے اور نہ پاکستانی قوم غیر منقسم برصغیر کی مسلمان قوم ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک اور پاکستانی قوم ایک نئی قوم ہے چنانچہ اس ملک کے رہنے والوں کو اس سرزمین سے محبت اور اس پر افتخار کرنا سیکھنا چاہیئے۔ یہاں جو کچھ موجود ہے، تاریخ سے ہمیں جو کچھ ملا ہے اُسے اپنائیں اور باہر سے جو کچھ آیا ہے اور ہماری تہذیب میں سرایت کر چکا ہے اُسے بھی قبول کریں۔

ہر چند کہ تاج محل، لال قلعہ اور سمرقند و بخارا سے ہمارے بہت قریبی رشتے رہے

ہیں لیکن یہ ہماری ملکیت نہیں ہیں۔ ہماری ملکیت موئن جودڑو ہے، سیہون شریف ہے ٹیکسلا ہے، لاہور ہے، ملتان ہے، خیبر ہے۔

مختصر یہ کہ تہذیبی معاملات میں ہمیں کنوئں کا مینڈک نہیں بننا چاہیئے۔ جہاں سے ہمیں جو کچھ ملا ہے اسے رد کرنے اور اسے اپنی تہذیب سے خارج کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف ہمیں طفیلی بھی نہیں بننا چاہیئے کہ اپنی ملکیت کو چھوڑ کے دوسرے کے مال پر فخر کرتے پھریں۔

تقریر، مضمون، فقرے، پوسٹر، اشتہار یا بیان و اعلان سے نہ تو تہذیب وجود میں آتی ہے اور نہ اُن سے اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

تہذیب محبت کا نشان ہے اور امن و آشتی کی آغوش میں پھلتی پھولتی ہے۔

اوراقِ فیض
اور
رئیس امروہوی

جناب فیض احمد فیضؔ نے کلچر کے بارے میں اپنی تصریحات پیش کی ہیں۔ کلچر کے بارے میں ٹیلی ویژن نے جس (دوسرے) مذاکرے کا لاہور میں اہتمام کیا تھا۔ محرومی ملاحظہ ہو کہ میں اُسے نہ سُن سکا۔ البتہ کراچی ٹیلی ویژن پر جو مذاکرہ (میزبان[1] ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) ہوا تھا اس میں موجود تھا اور پیر حسام الدین راشدی اور سید محمد تقی کے درمیان بیٹھا تھا۔ گفتگو تھی، پاکستانی کلچر پر۔ ایک بزرگ[2] نے مغلیہ کلچر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی قبیح النسبی (میں حرام زدگی نہیں کہوں گا) کی طرف اشارے کیے۔ یہ بھی فرمایا کہ مغل بادشاہ ہندو عورتوں کی اولاد تھے۔ نہ جانے اس تصریح کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ فیضؔ صاحب نے پاکستانی کلچر کے بارے میں ٹی وی پر جو کچھ کہا تھا مختلف روایات سُنی گئی تھیں۔ اس کے بارے میں عجیب طرح کی خلش تھی۔ لاہور کے ایک مؤثر روزنامے نے فیضؔ صاحب کے بیانات و خیالات کے خلاف زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ نہیں اب تک جاری ہے۔ اس طرح بات کافی الجھ چکی تھی۔ غالب کے تازہ شمارے میں جناب فیضؔ نے اپنے خیالات کی وضاحت کر دی ہے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ انھوں نے بجا طور پر ارشاد کیا ہے کہ نشری (فی البدیہہ) تقریر و گفتگو کا مسوّدہ سامنے نہ ہو تو آپ اس کے نکات کو صحت کے ساتھ پیش کر کے تنقید نہیں کر سکتے۔ فیضؔ صاحب نے ٹیلی ویژن کے مذاکرے میں کلچر کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اس کا مقصد و منشا وہ نہیں تھا جو یاروں نے سمجھا۔ کہتے ہیں (کلچر ـــــ ایک گفتگو) کہ "جو کچھ اس دوران میں پڑھ سکا

---

[1] ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مہمانِ خصوصی تھے۔ [2] بزرگ کا نام نہ لکھنے کی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی جبکہ تمام ناظرین نے دیکھ لیا تھا۔ یہ بزرگ پیر حسام الدین راشدی تھے۔

ہوں۔ اس سے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک آدھ بات جو مجھ سے منسوب کی گئی ہے۔ وہ مَیں نے نہیں کہی یا جس انداز سے وہ بات مجھ سے منسوب کی گئی ہے۔ اس طریقے سے مَیں نے نہیں کہی۔ کچھ مغالطہ سماعت کے سقم نے (جو نشری تقریروں کے سامعین کے لیے ناگزیر ہے) پیدا کیا اور کچھ تعصب نے۔"

فیضؔ صاحب کلچر کو طرزِ حیات یا پورا طریقۂ زندگی سمجھتے ہیں جس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری و باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ یقیناً کلچر پورا طریقۂ زندگی اور کسی قوم کی معنوی زندگی کا مکمل رُوحانی سانچا ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں، خیر و شر کی جو اقدار قائم کرتے ہیں، پسند، ناپسند کے جو معیار مقرر کرتے ہیں۔ وہ سب کا سب اُس روحانی سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے۔ کلچر کسی قوم کے نفسِ اجتماعی ادراک، تصوّر، تخیّل، تأثّر، اوہام اور تخلیق کاری کا ہمہ گیر مظہر ہے۔

فیضؔ صاحب کلچر کی دائمی قدر کو تسلیم نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں: "کلچر ہمیشہ تغیّر پذیر رہتا ہے"۔ اس قول میں نصف سچائی ہے۔ تغیّر پذیر تہذیب و معاشرت کے اوضاع و اطوار میں کلچر کی روح اس وقت تک کارفرما اور فعّال رہتی ہے۔ جب تک کسی قوم کا نفسِ اجتماعی — (روحانی ڈھانچہ) باقی رہتا ہے۔ ہندوستان کی آریہ قوموں کی ثقافتی روح (کلچر کی معنویت) آج بھی وہی ہے جو پانچ ہزار سال قبل تھی۔ البتہ ان کے رہنے سہنے کے طور طریق بدل گئے ہیں اور آریائی تہذیب میں بہت سے خارجی میلانات داخل و شامل ہو گئے ہیں۔ کلچرل پیٹرن اور بنیادی ثقافتی رجحان کبھی نہیں بدلتا۔ وہ ہر رنگ، ہر لباس اور ہر وضع و قماش میں اپنا اظہار کرتا رہتا ہے۔ یہودی خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی گوشے سے ہو اب تک توریت و تالمود اور موسیٰ و سلیمان کے معنوی ورثے کو اپنی روحوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسرائیل کبھی وجود میں نہ آتا۔ یہ ممکن ہے اور ایسا یقیناً ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بعض رسوم و روایات، طور طریقے اور رقص و موسیقی کے اسالیب کسی قدر الگ الگ ہوں لیکن

مسلم برِّ کوچک کی (برِّ کوچک کے لیے جنوبی ایشیا کی اصطلاح میرے حلق سے نہیں اُترتی اور میرے قلم سے نہیں نکلتی) کلچرل رُوح، ان کا نفسِ اجتماعی آج بھی وہی ہے جو سرسید و حالی، اکبر و جہانگیر، سوری و خلجی اور غوری و تغلق کے عہد میں تھا۔ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ہمارا تصوّر، اہرمن و یزداں کے بارے میں ہمارا نفسی رجحان اور پھر ان سب تصوّرات کے نتیجے میں زندگی اور موت، اور خیر و شر اور عیب و صواب اور انجامِ کار خود انسانی ارتقاء کی نسبت ہمارا عقیدہ ہزار سال سے لازوال ہے۔ اور تقسیمِ ہند کے ساتھ ہرگز ان تصوّرات میں اضمحلال پیدا نہیں ہوا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ مَیں یہ گفتگو "دین" کے نقطۂ نظر سے نہیں کر رہا۔ برِّ کوچک کا کوئی مسلمان لادینی ہو تب بھی اس کا کلچرل پیٹرن (شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر) وہی ہوگا جو ہمارے کسی عالمِ دین یا دیندار کا ہو سکتا ہے۔ برِّ کوچک سے ہمارا تعلق بارہ سو سال پُرانا ہے۔ اِن بارہ صدیوں میں ہماری زندگی کا ایک رُوحانی سانچہ وجود میں آگیا ہے اور ہمارا تصوّف، ہمارا ادب، ہماری موسیقی، الغرض ہمارے تمام تخلیقی مظاہر (تاج محل کے کنگروں سے لے کر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کافیوں تک) اِسی ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ زوال پذیر رُوحانی سانچے سے ڈھل کر نکلے ہیں۔ کلچرل مظاہر وہ ہیں جو ہماری رُوح کو متحرک کر کے ہمارے وجدان کو منوّر و درخشاں کر دیں۔ کلچرل مظاہر کی اہمیت ہی یہ ہے کہ وہ ہمیں یکایک سطحِ زمین سے بُلند کر کے ایک عجیب اور پُراسرار نشۂ ارتفاع سے سرشار کر دیتے ہیں۔ کیا موئنجوڈارو، ہڑپا اور ٹیکسلا کے آثار رُوحانی اہتزاز اور ذہنی بالیدگی کی یہ کیفیت ہم میں پیدا کر دیتے ہیں؟ پیدا کر سکتے ہیں؟ بے شک یہ بڑے قیمتی زمینی آثار ہیں۔ اور محکمہ آثارِ قدیمہ کو ان کی نگہداشت کی طرف پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ لیکن ان تاریخی آثار کو دیکھ کر ہمارے نفس میں کوئی تخلیقی سلیقۂ خیال اور کوئی رُوحانی تلامذہ نہیں اُبھرتا۔ بس اِک عبرت اور اِک تاریخی تجسّس کی کیفیت نمودار ہوتی ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کا منفی جذبہ بروئے کار آجاتا ہے۔

فیضؔ صاحب کا یہ مشورہ ہمیں گرہ (بلکہ عقل) میں باندھ لینا چاہیئے کہ کلچر اور ریاست

کی حدود یکساں نہیں ہوتیں۔ کیا ہوا اگر آج دہلی، آگرہ، حیدرآباد، مرشدآباد، لکھنؤ، بھوپال وغیرہ ہماری قلمرو میں شامل نہیں۔ ہمارا قلم تو ان میں شامل ہے۔

بقول فیضؔ :

"بلاشبہ ہمارے تہذیبی ورثے میں دہلی و آگرہ اور میرؔ و غالبؔ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح، سمرقند و بخارا اور حافظؔ و سعدیؔ اور رومی بھی شامل ہیں"۔

اس وضاحت کے بعد جناب فیضؔ نے کیا باون تولے پاؤ رتی کی بات کہی ہے کہ:

"لیکن تھوڑی سی تفریق بھی لازم ہے۔ اُن تہذیبی آثار و مظاہر میں جو اس وقت ہماری سرزمین میں موجود ہیں اور اُن مظاہر و آثار میں جو ہماری سرزمین سے باہر ہیں"۔

فیضؔ صاحب!

ہم اس تفریق کو ملحوظ رکھیں گے مگر آپ ہم سے یہ نہ کہیں کہ جاؤ موئنجوڈارو، ہڑپا، ٹیکسلا اور گندھارا سے روحانی فیضان اور تخلیقی سرشاری حاصل کرو۔ یہ بات ہمارے امکان سے باہر ہے۔ کیونکہ ہمارا ذہن، جیسا کہ ہے، پچھلے بارہ سو سال کے اندر وجود میں آیا ہے۔ ہم قبل مسیح کے عہد سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہماری روحانی ولادت اس کے بعد ہوئی ہے۔

(برِّ کوچک کی بارہ صدیاں)

اوراقِ فیض

اور

سلیم اختر

جب ٹیلی ویژن پر کلچر کے بارے میں فیض احمد فیض کی تقریر ہوئی تو سخت تعجب ہوا، کہ ٹی وی کو کلچر ایسے سنجیدہ اور قومی اہمیت کے مسئلے سے کیا لینا جب کہ ٹی وی پر پیش کیے گئے بیشتر پروگراموں سے اشتہارات کی فلمیں زیادہ معیاری ہوتی ہیں۔ یار لوگوں نے کہا کلچر سے ٹی وی کی اس یکایک دلچسپی میں ضرور کوئی رمز پوشیدہ ہے۔ رمز اگر تھی تو وہ اب تک سمجھ میں نہ آئی۔ سوائے اس کے کہ اس موضوع پر اخبارات اور جرائد میں بحث کے دروازے کھل گئے ایک مسئلے پر جتنی زیادہ بحث ہو گی۔ اور اس کے بارے میں جتنی زیادہ آراء کا اظہار کیا جائے گا۔ اس سے جہاں موضوع کی جزئیات نکھر کر سامنے آتی ہیں وہاں خلطِ مبحث کا اندیشہ بھی ہوتا ہے اور بات جب کلچر ایسے جذباتی مسئلے کی ہو تو بحث اور بھی اُلجھ جاتی ہے۔ کیونکہ کلچر سے وابستہ علاقہ، زبان، مذہب، ادب، فنون وغیرہ کی صورت میں جذبات وہیجانات کے جو سلسلے ملتے ہیں۔ ان کی بنا پر بالعموم غیر جذباتی ہونا، اگر ناممکن نہیں ہوتا تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

فیض صاحب فرماتے ہیں:

"...... پورے طریقۂ زندگی کو کلچر کہتے ہیں جس میں سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے، عقائد اور اقدار کے ذریعے بھی، عملی طور سے بھی زندگی کے آداب و رسوم سے اور زندگی کے روزمرّہ کا جو محاورہ ہے، اس کے ذریعے بھی۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ فنون، ادب، موسیقی مصوّری، فلم وغیرہ اسی کلچر یا (WAY OF LIFE) کے ترشے ہوئے اور منجھے ہوئے اجزا

ہوتے ہیں"۔

یہ تعریف خاصی وسیع ہے اور اس لیے اُس قطعیت سے عاری ہے جو ایک تعریف کا وصفِ خاص ہوتا ہے کہ غیر ضروری اور فروعی عناصر کے اخراج سے حدود متعین ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں (CULTURE) اور CIVILIZATION کے مفاہیم میں جب تک امتیاز نہ کیا جائے بات نہ بنے گی۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ فیضؔ صاحب بعض اوقات دونوں کو مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ زندگی کو اگر ایک قطعۂ اراضی سے تشبیہ دیں تو اس پر تعمیر ہونے والا مکان تہذیب ہوگا جب کہ اس کی نقاشی اور تزئین و آرائش کو کلچر قرار دیا جا سکتا ہے۔

زمین بنیاد ہے ہماری زندگی کی، زمین حصول خوراک کا ذریعہ اور ضامن ہے زندگی کی بقا کی۔ یہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد اُسی میں آسودہ خاک ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کا دائرہ زمین سے عبارت ہے۔ اساطیر میں دھرتی ماتا، مادرِ عظمیٰ اور اولاد کو کھا جانے والی ماں (DEVOURING MOTHER) کہہ کر سب ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

زمین پر تعمیر کیا گیا مکان پناہ اور تحفظ کے لیے ہے۔ یہ وہ چھتری ہے جس سے تمازت اور بارش سے بچتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی کھڑکیاں تازہ ہوا کے لیے، روشندان دھوپ کے لئے، دروازے آنے اور جانے کے لیے ہیں۔ ان سب کو کھلا رکھیں تو ہوا کے جھونکوں کی مانند تازہ اثرات قبول کرتے ہیں، بلکہ ان سب کو بند کر کے تازہ ہوا سے محرومی اور گھٹن پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ مکان تہذیب ہے اور مکین اُس مکان کے حوالے سے پہچانے جائینگے۔ مکان صاف ستھرا ہو تو مکین طہارت پسند کہلائیں گے، گندہ ہوا تو گندگی پسند۔ مکان میں رہنے والے تحفظ اور پناہ تو حاصل کرتے ہیں لیکن اپنی بد عادات سے مجبور ہو کر کچھ لوگ دیواروں سے پتھر اُکھاڑتے رہتے ہیں، دیواروں کو لکیروں اور داغ دھبوں سے گندی ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر گندی باتیں لکھ کر اپنے باطن کی گندگی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ الغرض!

شیشے توڑتے اور بنیادیں کھودتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی مل جاتے ہیں جو عمارت کی صفائی اور مضبوطی کی طرف توجہ دیتے رہتے ہیں۔ ٹپکتی چھتیں مرمت کرتے اور اکھڑتے پلستر ٹھیک کرتے ہیں، اُن کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن ان ہی کا دم غنیمت ہوتا ہے۔

زمین اور مکان کی اہمیت سے کوئی منکر نہ ہوگا لیکن جھگڑا اس وقت شروع ہوگا جب رنگ و روغن کرنے، نقش و نگار بنانے اور آرائش و تزیین کا وقت آئے گا، پھول کیسے ہیں، ان میں رنگ کیسے بھریں، گھر میں کیسے ڈیکوریشن پیشِ نظر رکھیں کہ وہ دیسی ہوں یا بدیسی۔ یہ سب جھگڑے والی باتیں ہیں۔ زمین اور مکان ایسی ٹھوس چیزوں کے مقابلے میں یہ غیر اہم اور بعض صورتوں میں تو غیر ضروری بھی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سارا فساد انھیں کا پیدا کردہ ہے کہ ان سے جذبات کے رشتے اور ہیجانات کے سلسلے ملتے ہیں، زمین اپنی نہیں، مکان ورثے میں ملا ہے اس لیے اُس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ناپسند ہونے پر بھی مکان نہیں ڈھایا جا سکتا لیکن اس کے رنگ و روغن تو تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ اندازِ آرائش تو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب کلچر ہے اور یہی بس کی گانٹھ!

تہذیب اور کلچر کے فرق کو دریا اور اس کی لہروں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تہذیب ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ دریا کے بہاؤ کی مانند ہے۔ ایسا دریا جس کا منبع کہیں دُور ماضی بعید کی تاریکی میں نہاں ہے اور اُسی دریا کے مختلف مقامات پر اُبھرتی اور ڈوبتی لہریں، کلچر۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ یہ کلچرل پیٹرن ہیں اس دریا سے نہریں بھی نکلتی ہیں اور اس میں نئے دریا بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مختلف تہذیبیں اور کلچرل اثرات ہیں۔ دریا کے طویل کنارے پر آباد مختلف بستیاں اپنے اپنے طور پر پانی سے استفادہ تو کرتی ہیں لیکن یہ پانی یا اس میں شامل ہونے والے دیگر دھارے بالعموم ان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ نہ ہی وہ اس طویل ترین دریا کے تمام پانی کو استعمال کرتے ہیں اور نہ اس سے وابستہ

تمام امکانات کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ یہ ناممکن ہوگا۔ ان کے حصّے میں تھوڑا سا پانی اور چند لہریں آتی ہیں۔ وہ اس پر تو فخر کر سکتے ہیں کہ اتنے طویل سفر کے بعد اس دریا کا پانی ان تک پہنچا ہے لیکن ان کے اپنے حصّے میں تمام دریا نہیں آتا۔

زمان و مکان اور تاریخ کے عمل کے کسی ایک لمحے میں جنم لینے والا فرد اپنی جبلّتوں کی مانند اپنے ملک کی تہذیب اور معاشرے کے کلچر سے فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ جبلّتیں اس کا وجود ہیں تو کلچر اس کا خارج۔ لیکن جبلّتوں کی مانند وہ آنکھیں بند کر کے کلچر کو اس کی تمام متنوّع صورتوں اور اس سے وابستہ جہت در جہت کیفیات کو معمولی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جبلّت اور کلچر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کلچر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جبلّتوں کے کچھ تقاضوں میں ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے۔ تو کچھ کو (SUBLIMATE) کرنا پڑتا ہے۔ بعض TABOOS کا احترام کرنا پڑتا ہے تو بعض کو توڑا جاتا ہے۔ اسی لیے تو کسی بھی کلچر میں تالاب کے پانی ایسی یکسانیت نہیں ملتی۔ بلکہ اس میں تغیّر کی لہریں وافر اور دائرے ملتے ہیں اور یہی کلچر کے مختلف رُوپ، جہات یا پیٹرن ہیں جو اپنی مجموعی صُورت میں (MOSAIC) کی مانند ہیں۔ مختلف قطع اور رنگوں کے شیشوں کا ایک کُل جو اپنی انفرادیت میں عجیب، پیچیدہ، اُلجھا ہوا اور ناقابلِ فہم نظر آنے کے باوجود اُس کُل میں ایک مخصوص مقام کا حامل ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان میں سے ایک کو بھی نکال دیں تو تمام MOSAIC مکمل نہ رہے گا۔ اور اس سے خوبصورت یا منفرد یا پُرکشش بھی نہ رہے گا۔

مَیں نے جب تہذیب کو دریا اور کلچر کو اس کی لہر بتایا تو اِس نکتے کی صراحت مقصود تھی کہ ہزار روپ بدلنے پر بھی کلچر پانی کی وہ لہر ہی رہے گا جو دریا کا ایک حصّہ ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہزار تنوّع کے باوجود بھی تہذیب اور کلچر کی اساس ایک ہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے اس تغیّر اور تنوّع کو PRISM میں سے نکلنے والی شعاع کے سات رنگوں

کی مانند سمجھنا چاہیئے۔ کلچر کی سطح پر یہی وحدت میں کثرت کا عمل قرار پائے گا۔ جب تہذیب اور کلچر کی یکساں اساس نہ رہے اور ان میں دوئی کا اظہار ہو تو عملی زندگی میں تضادات جنم لیتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی اپنا ملک بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ ہم اسلامی تہذیب کے داعی ہیں لیکن ہمارا کلچر مغرب سے مستعار ہے۔ پاکستان کیونکہ مذہب کے نام پر بنا تھا اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ ہماری تہذیب محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہوئی ہے یا ہڑپہ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا بھی اس میں شامل ہیں۔ ہر چند کہ یہ سوالات محض اکیڈیمک نوعیت کے ہیں لیکن ان سے وابستہ جذباتی رایوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ پاکستان کی تہذیب اسلامی قرار پائے یا آریائی یا دراوڑی ـــــ عملاً اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ان مباحث سے مروّج کلچر کے پیٹرن میں کسی طرح کی بھی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔

اسلامی تہذیب مسلم کلچر نہ دے سکی۔ اس سے عملی زندگی میں جو تضادات پیدا ہوتے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں انھیں منافقانہ طرزِ عمل سے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ منافقت ـــــ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی ـــــ قسم کے ذہنی رویّے کو جنم دیتی ہے۔ لیکن یوں کسی طرح کے تضادات کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت سے آنکھیں بند کرنا ہے۔ کیمو فلاج کرنا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نہ دیکھنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم عادتاً مذہبی ہونے کے باوجود عملاً مغربی ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو بننے کی کوشش میں مصروف ہیں نتیجۃً پاکستانی کلچر پر مذہبی اثرات برائے نام اور سطحی ہیں۔ جہاں تک مشرقی اقدار کا تعلق ہے تو وہ اب صرف فلموں کے جذباتی مکالموں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہماری سوچ، تعلیم، طرزِ عمل وغیرہ پر مغرب کا اتنا گہرا رنگ چڑھ چکا ہے کہ اسے دُور کرنے کے لیے اب کوئی "رنگ کاٹ" نہیں رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مغرب اب مشرق کو "دریافت" کر رہا ہے چنانچہ امریکہ میں ستار اب "ان" ہے۔ یہی نہیں بلکہ افریقی قبائل کے ملک سے لے کر کانگو کی

ڈرم بیٹ تک کی ایک رو ملتی ہے۔

فرد کی مانند قوم کا بھی ایسا مخصوص نفسیاتی مزاج ہوتا ہے جو عملی زندگی میں ان کے مجموعی کردار پر ایک خاص چھاپ لگاتا ہے۔ کسی قوم میں جتنی زیادہ نفسی توانائی ہوگی۔ اس میں اتنا ہی زیادہ کرداری استحکام ہوگا۔ اس سے باطنی توانائی کا جو احساس جنم لیتا ہے وہ خود اعتمادی اور استقامت پر منتج ہوگا۔ ہماری قوم میں اس داخلی توانائی کا خاصہ فقدان رہا ہے اور آج سے نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء سے اب اور اس کے اثرات محسوس کیے جا رہے ہیں ایک قوم ہونے کا احساس قومیت کے جس احساس کو جنم دیتا ہے وہی داخلی توانائی اور باطنی قوت کا سرچشمہ بنتا ہے۔ قوم افراد کی تعداد کے صفروں کا نام نہیں بلکہ ایک رسّی میں بٹے ہوئے ریشے کا یہ احساس ہے کہ اکیلا میں کمزور اور کچا ریشہ تھا لیکن اب میں ایک مضبوط رسّی ہوں۔ میں نے انفرادیت کی صورت میں اپنی کمزوری کو اجتماعیت کی صورت میں طاقت حاصل کی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہر ریشہ اپنی کمزوری کے احساس سے لرزاں رہے تو وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی قوت بڑھانے کے برعکس دوسرے ریشوں کو خود سے زیادہ کمزور دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس سے بھی اسی ہی قوت کا احساس پیدا ہوگا یعنی یہ کہ منفی نوعیت کا ہوگا کیونکہ اب رسّی کی قوت، داخلی توانائی اور اجتماعی مضبوطی کے احساس پر مبنی نہیں بلکہ دوسروں کی کمزوری کے احساس سے تسکین پاتی ہے۔ چار قومیتوں کے مسئلے کو بھی اس روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ خود کو پاکستانی قوم سمجھتے ہوئے ہم ہزار ٹکڑوں میں بٹ جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر یہ نعرہ خوف اور نفرت کی کوکھ سے جنم لے تو پھر بات اور ہو جاتی ہے اس لیے فیض صاحب کا نہایت معصومیت سے یہ کہہ دینا کہ چار قومیتوں کے پرچار کو صوبائی تعصب کا رنگ دینا قطعی غلط اور گمراہ کن ہے محل نظر قرار پاتا ہے۔ فیض صاحب اسے اصلاحات کی بیکار سی جنگ کہہ کر نفرت کی شدت کو کم یا ختم نہیں کر سکتے۔

اس ضمن میں بالعموم روس کی مثال دی جاتی ہے کہ اتنے بڑے ملک میں سب قومیتیں

کلچر اور زبانیں برقرار ہیں اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ معجزہ باہمی اُنس کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ اسٹالن کے اُس حیرکا تھا جس نے لاکھوں کی LIQUIDATION سے خوف وہراس کی وہ فضا قائم کی کہ ہر ایک کو جان کے لالے پڑ گئے۔ قوم، زبان اور کلچر کے بکھیڑوں میں کون الجھتا۔

اوراقِ فیض

اور

آغا سہیل

مَیں نے ٹی وی پر فیضؔ صاحب کی تقریر سُنی تھی اور جریدۂ غالب میں ان کے شذرات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ فیضؔ صاحب سے بالکل متفق ہُوں کہ کلچر نام ہے معاشرتی زندگی کے جملہ حرکات و سکنات کا جو فرد سے جماعت تک محیط ہے۔ جملہ فنونِ لطیفہ میں بھی اس کا اظہار ہوتا ہے اور فنونِ لطیفہ کے اظہار و ابلاغ کے ذرائع سے اس کی اشاعت و ترویج ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ اور ان کے ابلاغ کے نئے پرانے ذرائع اور ان روایات میں ثقافت کا تحفظ ہوتا ہے۔

مَیں اپنی جگہ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کلچر کسی ملک کے ادب، طرزِ معاشرت، فنونِ لطیفہ، فلسفیانہ خیالات، تمام قسم کی ترقیوں (بشمول مادّی) کے اجتماعی احساسات کا مظہر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ کلچر کو اس سے کوئی مختلف شے سمجھتے ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں اور کن حوالوں سے سمجھتے ہیں؟ اگر کوئی مصری یہ دعویٰ کرے کہ وہ ثقافتی لحاظ سے پانچ ہزار سال سے مصری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پانچ ہزار سالہ ثقافتی روایات جو اُس کے معاشرے میں محفوظ ہیں وہ ان کا وارث ہے۔ ظاہر ہے کہ پانچ ہزار سالہ مذہب اسلام نہیں ہے لیکن وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ پانچ ہزار سال سے مصری ثقافت کا امین ہے۔ تیرہ سو سال سے اسلامی روایات کا محافظ ہے اور جدید مصر کا بیس سال سے شہری ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مذہب اسلام کی نفی کرتا ہے بلکہ وہ اظہارِ حقیقت کر رہا ہے۔

البتہ غیر مسلم مصری اپنے مذہب کے حوالے سے ایسی بات میں جزوی ترمیم کر سکتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ثقافت یا کلچر کی جڑیں کسی جغرافیائی حدود میں بھی ہیں، روایات میں بھی ہیں۔ اسلام جب ایران میں پہنچا تو اسلام کے بنیادی عقائد قبول کر لینے کی سفارش کے سوا اہلِ اسلام نے اہلِ ایران سے اور کوئی تقاضا نہیں کیا۔ حضورؐ کی حیات میں جب اسلام کی دعوت ایک دور دراز کے ملک میں پہنچی تو سوائے اساسی نظریات کے قبول کر لینے کے اور کوئی تقاضا نہیں کیا گیا کیونکہ خلافِ فطرت کسی بات کا تقاضا عبث ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگوں کو مغالطہ پیدا ہوتا ہے اور جس کی بنیاد عصبیات پر ہے وہ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں تو بہ آسانی اپنے نظریات میں ترمیم کر لیں گے۔

میں یہاں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ کلچر بقول فیض صاحب کوئی جامد شئے نہیں ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً تغیرات رونما ہوتے رہے ہیں اور ان تغیرات کا جاری رہنا اس کی بقا اور ارتقاء کی دلیل ہے۔ مثلاً برِصغیر میں آریوں کی آمد سے قبل اور بعد کے حالات کا جائزہ لیجیے۔ برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل اور بعد کے حالات کا مطالعہ و قس علیٰ ہذا سندھ میں شمالی و جنوبی ہند سے ہجرت کر کے آنے والوں سے قبل اور بعد کے حالات کا جائزہ لیجیے تو واضح ہوگا کہ جس سرزمین کو آنے والوں نے اپنا وطن بنایا اس سے اپنا گہرا ناتہ جوڑا اور وہاں کے روایات کو قبول کر لیا، خواہ کلی طور پر، خواہ جزوی طور پر، خواہ جلد یا بدیر، انھیں ایسا کرنا پڑا۔ اس کے بغیر چارہ کار نہ تھا۔ کسی جگہ سے اکھڑ کر آنے والوں کی مثال ایک پودے کی سی ہے جو اپنی جڑوں میں تھوڑی سی مٹی لے کر آتا ہے اور پھر جب اپنی جڑیں نئی سرزمین میں پھیلاتا ہے تو چنار درخت بن جاتا ہے۔ پھر تو اسی سرزمین سے گہرا ناتہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اسی سرزمین میں پنپتا ہے اور اسی میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لیکن تناور درخت اکھڑ کر دوسری سرزمین میں نہیں جمتے۔ وہ سوکھ کر بے برگ و

بار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے ہی بے برگ و بار سُوکھے ہُوئے درختوں سے آج تک صدائے نالہ و شیون اُٹھ رہی ہے ـــــ میرا خیال ہے اُٹھنے دیجیے، آپ سرسبز و شاداب پودوں کی طرف توجہ دیجیے۔

یہ بھی واضح رہے کہ درخت درخت کی بات ہے۔ تمام درخت ایک جیسے پھل نہیں دیتے۔ بعض اوقات درختوں کی کثرت سے جغرافیائی اور موسمی حالات میں تغیّر رُونما ہو جاتا ہے۔ فیضؔ صاحب نے کہا ہے "معاشرے کا جو ڈھانچہ ہوگا، اس کی جیسی ہیئتِ ترکیبی ہوگی یا جیسا سوشیل اسٹرکچر ہوگا، کلچر تمام تر اُس کے تابع ہوگا۔ جیسے جیسے سیاسی یا معاشرتی حالات بدلتے ہیں۔ اُسی کے مطابق کلچر کے تصوّرات اور اس کی اشکال کی بھی بدلتی رہتی ہیں، یا بدلنی چاہییں۔ کلچر نہ کوئی جامد شئے ہے نہ اُسے دوام حاصل ہے۔ ازل سے آج تک صدیوں کی اِس دوڑ میں کتنے ہی کلچر پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے یا ان میں ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔ اِسی باعث مَیں نے کہا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ کلچر کے تصوّرات اور اشکال میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے"۔ اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کڑوے پھل والے درختوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ان کی جگہ نئے اور میٹھے پھل والے درخت لیتے ہیں۔ آریوں نے اگر برِصغیر کے بعض علاقوں کو اپنا وطن بنایا اور یہاں کے روایات کو قبول کیا تو یہاں کے روایات کو متاثر بھی کیا، ان میں تبدیلیاں بھی کیں، ان کی شکست و ریخت بھی ہوئی اور آہستہ آہستہ نئی تعمیر بھی ہُوئی۔ برہمنوں کے سماج نے غیر آریہ لوگوں پر کڑی پابندیاں عائد کیں، سنسکرت کو دیوتاؤں کی زبان قرار دیا تو جین اور بدھ مذاہب شدید ردِّ عمل کے طور پر ایک سیلِ رواں کی طرح اُٹھے اور برہمنوں کے سماجی روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئے۔ گویا سیاسی اور معاشرتی حالات نے تاریخ کے دھارے کو بدلا تو ثقافت پر بھی اثر ڈالا۔ فنونِ لطیفہ کے اسالیب بھی اُس کی لپیٹ میں آگئے اور کلچر کے ماخذ میں تغیرات کے سبب بجائے خود کلچر میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ معاشرے کے ڈھانچے اور اسکی ہیئتِ ترکیبی

سے یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ہمارے دیہی علاقوں میں پنگھٹ ختم ہوگئے ٹیوب ویل آگئے۔ پنگھٹ کے گیت اس کے ساتھ ہی رخصت ہوگئے اور جگہ جگہ کسانوں کے پاس ٹرانسسٹر نظر آنے لگے، حقے کی جگہ سگریٹ نے لے لی، ہل کی جگہ ٹریکٹر آگیا اور لسی کی جگہ چائے اور کوکا کولا نے حاصل کرلی۔ اب خواہ مصور ہو، شاعر ہو، ادیب ہو، فلسفی ہو اسی سباق اسباق میں ثقافتی مظاہر کو دیکھے گا اور اپنے عہد کی صنعتی تبدیلی کے ذیل میں تمام نقوش ابھارے گا۔

مَیں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر تمام مکاتبِ فکر کے دانشوروں کو ایک مرتبہ کھل کر بحث میں حصہ لینا چاہیئے اور ہمارے نئے پاکستان میں قومی، علاقائی، مقامی اور غیر مقامی کا تشخص کر لینا چاہیئے تاکہ نئی نسل کے اذہان میں تعصبات، توہمات اور ابہام کی دھند باقی نہ رہے۔ آپ نے فیض احمد فیض صاحب کے شذرات کے طفیل مَیں اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے بہتر نتائج کا استخراج و استنباط ممکن ہو سکے گا۔

فیض صاحب نے کہا ہے "برصغیر کی تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت ایک نوع کی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اس میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔ اور اسی کے مطابق ہمیں اپنے کلچر کا تصور قائم کرنا چاہیئے تھا۔ جو اب تک ہم نے نہیں کیا۔"

میرا خیال ہے کہ فیض صاحب نے بجا ارشاد فرمایا ہے۔ لیکن اوپر کہیں مَیں نے اس کا سبب عرض کیا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہاں سے آنے والوں کے اذہان میں بھی انتشار تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو بھی پرانے نظامِ معیشت نے جکڑ رکھا تھا۔ ایک بات بھی ہے کہ ادھر سے آنے والوں نے (قارئین کو بتا دیجیے کہ راقم الحروف بھی انہیں آنے والوں میں شامل ہے) پاکستان کو اپنے نظریات کی جاگیر سمجھ رکھا تھا اور اس وہم میں مبتلا تھے کہ سب کچھ ان کے خیالات، تصورات، احساسات، جذبات اور سوچوں کے مطابق ہو گا یا ہونا چاہیئے اور اگر نہیں ہو سکا تو اس میں انھیں اپنا تصور نظر نہیں آیا۔ شائد نظر آجاتا لیکن لیاقت علی خاں کے بعد سے آمرانہ نظامِ حکومت

یکساں طور پر قائم رہا۔ سوچ اور فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے اور کم و بیش بیس سال (جو اس ریاست کے نہایت اہم بیس سال تھے اور جس میں قومی، علاقائی، مقامی اور غیر مقامی کا تشخص ہونا تھا، عوام الناس کی ذہنی تربیت ہونا تھی) ضائع ہو گئے۔ اِس مدت میں محلاتی سازشیں، شخصیتوں کے جوڑ توڑ اور اسی نوع کی فضول باتیں ہوتی رہیں جن کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج یہ نکلا۔ میرا خیال ہے فیضؔ صاحب کا مشورہ صائب ہے کہ "پاکستان بننے کے بعد اِس میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اور اُسی کے مطابق ہمیں اپنے کلچر کا تصور قائم کرنا چاہیئے تھا جو اب تک ہم نے نہیں کیا"۔ اب بھی زیادہ وقت نہیں گیا صرف ایک نسل آگے گئی ہے اس کی قربانی دے کر ہمیں یہ قرض ادا کر لینا چاہیئے۔

آگے چل کر فیضؔ صاحب کے شذرات غالباً زیادہ متنازعہ فیہ نظر آئیں گے۔ مَیں یہاں پہلے پورا پارہ نقل کرتا ہوں، پھر اس پر گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔

"برِصغیر کی تقسیم سے ایک نیا ملک وجود میں آیا۔ پاکستان۔ ایک نئی قوم وجود میں آئی۔ پاکستانی قوم۔ پاکستان میں مختلف علاقے ہیں اور ہر علاقے کی اپنی اپنی مخصوص زبان اور مخصوص رسوم و رواج ہیں جو نہ تو کسی فیکٹری کے تیار کردہ مال کی طرح ہیں اور نہ کسی حکومت کے بنائے ہوئے قاعدے قانون کا نتیجہ، بلکہ تمام تر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں۔ مختلف علاقوں کی جب بات ہو تو ہمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ان میں بہت سے مشترک اجزاء ہیں جو ہمارے قومی کلچر کی اساس ہیں۔ ان میں سب سے اہم عنصر اشتراکِ دین ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مشترک اجزاء کا ایک سبب جغرافیائی قربت ہے اور دوسرا سبب یکساں تاریخی تجربات"۔

آگے چل کر دوسرے پارے میں اسی بات سے مربوط کر کے بات کو یوں آگے بڑھایا ہے

"ملک کے دو یا دو سے زیادہ علاقوں کی تہذیبوں میں جو فرق ہے اُسے فرق سمجھنا چاہیئے تضاد نہیں اور ان میں اشتراک و یگانگت کی جتنی ممکن صورتیں ہیں اُن پر توجہ

کرنی چاہیئے اس لیے کہ قومی یک جہتی ان اختلافات یا تفریقات کی نفی کرنے سے وجود میں نہیں آسکتی بلکہ ان کے اقرار کے بعد تمام مماثلت کو یکجا کرنے سے ہی ممکن ہے۔ دُنیا میں کوئی ملک ایسا ہے، نہ کبھی ایسا تھا جس میں اُس مُلک کے تمام علاقوں کی تہذیب بالکل یکساں تھی اور اُن میں کبھی کوئی فرق یا اختلافات نہیں تھے۔ کیا انگلستان میں اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی تہذیبیں یکساں ہیں؟"

یارانِ طریقت نے اس کو چار قومیتوں کی وکالت قرار دے لیا جو اتفاق سے ملک کی ایک کالعدم جماعت کے منشور کی اساس بھی ہے۔ قوم مشرقی پاکستان کے سانحے سے حساس ہے۔ اس لیئے ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جاتی ہے۔ ممکن ہے اِسی مفروضے پر مغالطہ ہوا ہو۔ حالانکہ یہ بدیہی بات ہے کہ فیض صاحب کا مافی الضمیر بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہر علاقائی تہذیب اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے اور تہذیبوں کا تحفظ بہرحال ناگزیر ہے جو ہم نے نہیں کیا بلکہ المیہ مشرقی پاکستان اُسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس سے چار قومیتوں کے پرچار کی بات نہیں نکلتی۔ آگے چل کر فیض صاحب نے "قوم" کے فرسودہ تصوّر کی مثال دی ہے کہ "ہیمو کو قوم کا بقّال کہنا کسی قوم کی نشاندہی کرتا ہے جو غلط ہے۔ اس طرح تو اِس برِصغیر میں ہزارہا اقوام کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ یہ دُرست ہے کہ اسلام اس کی سختی سے مخالفت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اسلامی ممالک کے مابین جو امتیازات تیرہ سو سال سے چلے آرہے ہیں وہ تو جُوں کے توُں موجود ہیں۔ لُطف یہ ہے کہ امتیازات ہزارہا سال پرانے ہیں۔ غرض یہ کہ چار علاقوں کے مجموعے کا نام پاکستان ہے لہذا وہ ایک قوم ہے جس کو فیض صاحب نے شروع ہی میں تسلیم کرلیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ قوم کے معاملے میں ہمیں فراخ دل ہونا چاہیئے اور قوم کو اسقدر محدود اور تنگ نہیں بنانا چاہیئے کہ اس میں چار تہذیبوں یا چار علاقائی تہذیبوں کی سمائی ممکن نہ ہوسکے۔

اوراقِ فیض

اور

ڈاکٹر وزیر آغا

آپ نے اپنے جریدے میں جناب فیض احمد فیض صاحب کا مضمون "کلچر — ایک گفتگو" شائع کر کے اس گرد کو ایک بڑی حد تک صاف کر دیا ہے جو فیض صاحب کی ٹیلی ویژن تقریر کے بعد فضا میں معلق ہو گئی تھی اور جسے اہلِ وطن کے تلخ و ترش ردِ عمل سے اٹھنے والے غبار نے مزید گدلا کر دیا تھا۔ فیض صاحب نے اپنے اس مضمون میں اپنے اصل موقف کو بڑے صاف ستھرے اور دل کش پیرائے میں پیش کر دیا ہے لہٰذا فیض صاحب سے اب وہ باتیں منسوب نہیں ہونی چاہئیں جن سے وہ خود انکار کرتے ہیں، عرصہ ہوا انھوں نے ایک شعر کہا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ شکایت وہ آج بھی کر سکتے ہیں تاہم اس معاملے میں کچھ قصور فیض صاحب کا اپنا بھی ہے وہ یوں کہ فیض صاحب اپنے بارے میں کہی گئی باتوں کا ذرا کم ہی نوٹس لیتے ہیں۔ یہ بات اچھی تو ہے لیکن صرف اس صورت میں جب فریقِ مخالف دلیل کے بجائے دشنام سے کام لے رہا ہو مگر جہاں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو وہ خاموش رہنا نیم رضامندی کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لیے فیض صاحب یہ کرم کریں کہ وقتاً فوقتاً "کلچر — ایک گفتگو" ایسا وہائٹ پیپر ضرور شائع کر دیا کریں تاکہ مطلع صاف ہوتا رہے۔

اپنے اس مضمون میں فیض صاحب نے سب سے اہم بات یہ کہی ہے کہ علاقائی کلچر بعض باتوں میں قومی کلچر سے ہم آہنگ لیکن بعض دوسری باتوں میں مختلف ہوتا ہے لہٰذا اس اختلاف کے ذکر کو چار قومیتوں کا پرچار کہنا یا صوبائی تعصبات کا رنگ دینا قطعی غلط اور گمراہ کن ہے" — جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فیض صاحب چار قومیتوں کے پرچارک ہرگز نہیں۔ اس تصریح کے

بعد وہ ساری بحث بے معنی نظر آتی ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز میں فیض صاحب پر علاقائی عصبیت کو ہوا دینے کا الزام ہے۔

فیض صاحب نے دوسری اہم بات یہ کہی ہے کہ "پاکستانی معاشرہ غیر منقسم ہندوستانی معاشرہ نہیں ہے اور نہ پاکستانی قوم غیر منقسم برصغیر کی مسلمان قوم ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک اور پاکستانی قوم ایک نئی قوم ہے چنانچہ اس ملک کے رہنے والے کو اس سرزمین سے محبت اور اس پر افتخار کرنا سیکھنا چاہیے۔"

فیض صاحب کے اس بیان کی کئی سطحیں ہیں

پہلی یہ کہ پاکستانی معاشرہ غیر منقسم ہندوستان کا معاشرہ نہیں۔ یہ بات درست ہے۔ دوسری یہ کہ پاکستانی قوم غیر منقسم برصغیر کی مسلمان قوم نہیں۔ یہ بات محلِ نظر ہے۔ وجہ یہ کہ پاکستانی قوم تو تقسیم سے پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی۔ تقسیم نے تو محض اس کی توثیق کی۔

تیسری یہ کہ پاکستانیوں کو سرزمینِ پاکستان سے پیار کرنا چاہیے، یعنی دوسرے دیس میں چھوڑی گئی ثقافتی سطحوں کا NOSTALGIC انداز میں ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ تاکہ پیار تقسیم نہ ہو جائے

اس تیسری بات کی تہہ تک اترنے کی ضرورت ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ فیض صاحب کے اس بیان کا اصل مقصد ان حضرات کو سرزنش کرنا ہے جو اتر پردیش کے کلچر کو پاکستان میں رائج دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہر چند تاج محل، لال قلعہ اور سمرقند و بخارا سے ہمارے قریبی رشتے ہیں لیکن یہ ہماری ملکیت نہیں ہیں۔ ہماری ملکیت موہنجوداڑو ہے، سیون شریف ہے، ٹیکسلا ہے، لاہور ہے، ملتان ہے، خیبر ہے"۔ ملحوظ رہے کہ اس فقرے میں سمرقند و بخارا کا ذکر محض برائے بیت ہے۔ یوں بھی چونکہ سمرقند و بخارا ننھال ہندو بخشے جا چکے ہیں اس لیے شاید فیض صاحب نے غیر شعوری طور پر انھیں بھی غیر منقسم برصغیر کے کلچر کا حصہ سمجھ لیا ہے۔ مگر خیر۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستانی کلچر سے لال قلعہ اور تاج محل کو (اور سننے میں آیا ہے کہ فیض صاحب نے اس ضمن میں میر اور غالب کا بھی ذکر کیا تھا) خارج

کرنے کے فوراً بعد فیض صاحب کو خیال آیا کہ یہ تو زیادتی ہو گئی۔ لہٰذا انہوں نے بغیر کسی توقف کے اس بات کا اضافہ کر دیا کہ "ہمیں کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہیئے جہاں جہاں سے ہمیں جو کچھ ملا ہے اسے رد کرنے اور اسے اپنی تہذیب سے خارج کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں" ـــــ تو پھر بات کیا ہوئی! اگر لال قلعہ اور تاج محل ہماری ثقافتی روایت اور ورثے کا حصہ بن چکے ہیں اور اس ورثے کی اہمیت کو فیض صاحب تسلیم کرتے ہیں تو پھر ان کے بارے میں کہنا کہ "یہ ہماری ملکیت نہیں ہیں"، محض تضاد بیانی کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ خود فیض صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ وہ بنیادی مشترک اجزاء ہمارے قومی کلچر کی اساس ہیں ان میں سب سے اہم عنصر اشتراک دین ہے۔ ٹھیک!

مگر پھر کیا آپ اس مذہبی اور ثقافتی ورثے کو اپنی ملکیت قرار نہیں دیں گے جو ہر چند وطن کی سرزمین سے باہر ہے لیکن جو دین کے وسیلے سے پاکستانی قوم اور ثقافت کا ایک اہم عنصر بن چکا ہے۔ فیض صاحب کی اس بات سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے کہ کلچر کوئی جامد شے نہیں مگر میں اس میں یہ اضافہ ضرور کروں گا کہ نہ تو کلچر دوسری اشیاء کی طرح درآمد کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے آرڈر پر تیار کرنا ہی ممکن ہے کلچر تو ایک خاص خطۂ زمین میں موجود مختلف عناصر کی آمیزش اور آویزش سے خود بخود ایک خاص رنگ اختیار کرتا ہے ـــــ ان عناصر میں ہوا، پانی، موسم، زمین کی خاصیت اور خون کا گروپ یہ سب چیزیں شامل ہوتی ہیں، لہٰذا کسی خاص خطۂ زمین کے کلچر کو دوسری ثقافتوں سے جدا کر کے دکھانا ممکن ہے۔ مسئلہ صرف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں نئی سیاسی سرحدوں کے وجود میں آنے کے باعث ایک نیا خطۂ زمین ابھرتا ہے۔ کچھ عرصے تک اس نئے خطۂ زمین میں ایک ثقافتی یا تہذیبی غدر کی سی فضا رہتی ہے۔ بعض لوگ اس تہذیب کو اپنا ورثہ سمجھتے ہیں جسے وہ باہر سے اپنے ساتھ لائے ہیں اور بعض اس کلچر کو جسے وہ سیاسی یا نظریاتی طور پر مفید سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے اپنے علاقے کی ثقافت کو پورے خطۂ زمین پر حاوی کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر اس نئے خطۂ زمین میں نئی سرحدوں کے باعث زود یا بدیر ایک ایسی فضا پیدا ہو

جاتی ہے جس میں مختلف اور متنوع عناصر آمیزش اور آویزش کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایک نئی ثقافت میں ڈھل جاتے ہیں۔ پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے پاکستانی کلچر نہ تو محض وہ کلچر ہو گا جس کے نمائندے تاج محل اور لال قلعہ ہیں۔ (اور جنھیں فیض صاحب خارج کرنا چاہتے ہیں) اور نہ محض موہنجوداڑو، پشاور اور لاہور (جنھیں فیض صاحب اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔) پاکستانی کلچر تو ابھی کٹھالی میں ہے اور کچھ عرصے کے بعد ہی ان جملہ عناصر کے امتزاج سے تشکیل پا سکے گا۔ بلکہ اس میں تو مغربی تہذیب کے بہت سے عناصر بھی شامل ہو جائیں گے۔ تاہم یہ کلچر نوعیت کے اعتبار سے محض امتزاجی نہیں ہو گا بلکہ اس خطۂ زمین کا نمک، پانی اور موسم اس پر اپنی چھاپ بھی لگائے گا جس میں یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔

فیض صاحب نے ایک اور بات یہ کہی ہے کہ کلچر اور ریاست کے حدود عام طور پر یکساں نہیں ہوتے۔ اس کی ایک مثال مشرقِ وسطیٰ کا وہ عرب علاقہ ہے جہاں ثقافتی ہم آہنگی کے باوصف الگ الگ ریاستیں قائم ہیں۔ مگر یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ کلچر جغرافیہ کی پیداوار ہے اور ریاست ہمیشہ ایک نئے جغرافیے کو وجود میں لاتی ہے۔ لہٰذا ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اس کی تحویل میں آیا ہوا کلچر اپنی صورت بدلنے لگتا ہے اور نئی سرحدوں کے اثرات کے تحت بالآخر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ایک اہم مثال ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ کسی زمانے میں امریکہ اور انگلستان ایک جان دو قالب تھے مگر جب امریکہ انگلستان سے منقطع ہو کر ایک نئی ریاست بن گیا تو آہستہ آہستہ اس کا کلچر انگلستان کے کلچر سے الگ ہونے لگا۔ لہٰذا پاکستان کو وجود میں آئے بمشکل ۲۸ برس ہوئے ہیں مگر ابھی سے پاکستانی کلچر کے خدوخال دکھائی دینے لگ پڑے ہیں۔ تاہم ابھی پاکستانی کلچر کو پوری طرح وجود میں آنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے۔

اوراقِ فیض

اور

جسٹس ایس اے رحمان

پاکستان کے حوالے سے ثقافت کا مسئلہ اہم بھی ہے اور نازک بھی۔ اہم اس لیے کہ اس کا تعلق پاکستان کے اساسی نظریئے سے ہے۔ نازک اس لیے کہ بعض علاقائی عصبیت کے عقیدت مند اس بارے میں حد سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نازک طبعی نے مرکز گریز رجحانات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان کی رائے میں پاکستانی ثقافت ایک مہم سا مفروضہ ہے۔

جب فیض صاحب کہتے ہیں کہ کلچر گانے بجانے یا لہو لعاب کا نام نہیں تو میں اپنے آپ کو ان کا ہم رائے پاتا ہوں۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کلچر کے محض ایک رُخ کا مظاہر ہیں۔ میرے نزدیک کلچر یا ثقافت ایک انسانی جماعت کے تصورِ زندگی سے لے کر اس کی عملی زندگی کے تمام ظاہری اور نفسیاتی پہلوؤں تک محیط ہے۔ اسی مفہوم کو غالباً فیض صاحب نے "پورے طریقۂ زندگی" سے تعبیر کیا ہے۔

میں نے تصورِ زندگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ تصور شعوری بھی ہو سکتا ہے اور تحت شعوری بھی۔ یہ دونوں صورتوں میں فکر و عمل کے سانچے تیار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے ظاہر ہے کہ تصورِ زندگی اور مذہب کا رشتہ بہت گہرا ہے۔

"ٹی ایس ایلیٹ نے تو اپنے "نوٹس آن کلچر" میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ کلچر کا جوہر گویا ایک انسانی جماعت کے مذہب کی تجسیم ہے"۔ علامہ اقبال نے بھی ۱۹۳۱ء میں اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں کہا تھا کہ "ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے

خطّوں میں بھی اسلام کا معاشرتی ڈھانچہ کلیتہً اسلام کی بحیثیت ایک مخصوص اخلاقی نصب العین سے فیض یافتہ کلچر کی عملیت کا نتیجہ ہے۔" اس خطبے میں یہ مختصر مگر پر معنی فقرہ بھی شامل ہے کہ "فرقہ واریت اپنے بہتر پہلو میں کلچر ہے۔ علامہ کے نظام فکر میں مذہب بطور ایک معاشرتی عامل، دیگر تمام عوامل پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام بعض دوسرے مذہبی نظاموں کے برعکس فرد اور خالق کے باہمی رشتے تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک فعال عنصر کی شکل میں دخیل ہے۔

پاکستان کے نظریاتی نقشے کی جزئیات کی توضیح علامہ اقبال کی تضیفات میں اور عملی سیاست کے لحاظ سے اس کی بنیادی سرحدوں کی تصریح قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تقریروں میں ہوئی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے متعدد اقوال شاہد ہیں کہ پاکستان کا خطہ اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ ہندی مسلمان ایک ایسی مملکت اور ایک ایسے معاشرے کی آزادانہ تشکیل کر سکیں جن میں اسلامی اقدار زندگی سموئی جا سکے۔

پاکستانی ثقافت پر گفتگو کرتے وقت اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ اسلام کے سرچشمۂ فیضان سے سیراب نظام، متعصب، تنگ نظر یا کم ظرف نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی ابدی اقدار درحقیقت بلند ترین آفاقی اقدار ہیں۔ اس کے نظام فکر میں اذعانی عنصر اگر کوئی ہے تو وہ صرف خدا کی یکتائی اور رسولِ اکرمؐ کی ختم نبوت پر ایمان تک محدود ہے۔ عمرانی تاریخ پر نظر رکھنے والے ہر مذہبی شعور کے اہلِ انسان کے لیے یہ دونوں اصول قابلِ قبول ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کے مضمرات انسانی حرّیت کے ضامن ہیں۔

اسلام کا تصورِ حیات ہمہ گیر مثبت اور حرکی ہے۔ یہ اپنے اصول اجتہاد کے طفیل زمان و مکان کے تغیرات کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اسلامی عمرانی نظام، نسل، رنگ، زبان اور جغرافیہ کے اختلافات سے بالاتر ہے اور ایک عالمگیر اخوت و مساوات کا داعی ہے۔ اس

کی بافت میں اوسط امور کا سنہرا رشتہ جاذب نظر ہے۔ یہ نظام قائم ہو جائے تو نہ اس میں سرمایہ داری کے استحصالی امکانات ہوں گے۔ نہ اشتراکیت کی انفرادیت کش عسکریت۔ اس کے تحت زائد از ضرورت ذاتی املاک اجتماعی مفاد کی خاطر اہل استطاعت کے ہاتھوں میں بہ منزلہ امانت ہوں گی۔ اس کی نگاہ میں علوم و فنون میں ترقی کی کوشش اگر ارفع مقاصد کے لیے تسخیر کائنات کا موجب ہو تو عین عبادت ہے۔ اس کا ہر فرد نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کے اجتماعی معاملات مساوات کے سائبان تلے خدا کا خوف دل میں رکھ کر باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔ ان میں کوئی شق ایسی نہیں جس پر جدید تر ترقی پسندی انگلی اٹھا سکے۔

ایسے معاشرے میں جہاں رہنمائی کی باگ ڈور ایک جامع نظام کے ہاتھوں میں نہ ہو جیسا کہ اسلام ہے۔ کسی ایسے عنصر کو پذیرائی نہیں مل سکتی جو اس کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو۔ اسلامی نظام، زندگی کی رنگا رنگ فکری اور عملی تحریکوں سے تعرض نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس اصول کے تابع ہوں۔ اس نظریے کی روشنی میں صوبائی یا علاقائی رسم و رواج کے اختلافات، زبان و ادب کی متبادل شکلیں اور فکر و فن کے گوناگوں انداز اس تعارفی سطح پر رہتے ہیں جس پر قرآن کریم شعوب و قبائل کے وجود کو رکھتا ہے

علاقائی زبان ادب اور فن کے سلسلے اگر اسلام کے اجتماعی نقطہ نظر سے نہ ٹکرائیں، تو ان کا خوشدلی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ ذہنی انتشار کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب علاقائی آثار و تخلیقات کو وہ مقام دینے کی کوشش کی جائے جو اجتماعی نظام فکر و عمل کے لیے مخصوص ہے۔ اگر پرواز میں طائر کی آنکھ نشیمن پر ہے تو گمراہی کا خطرہ نہ ہوگا۔ یہ نشیمن وہی ہے جس کی نشاندہی اقبال کی مسجد قرطبہ میں لکھی گئی دعا کے اس جادو جگانے والے شعر سے ہوتی ہے۔

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو

ملک کے مختلف حصوں کے درمیان افہام و تفہیم کے لیے ایک مشترک زبان ضروری ہے۔ میری نظر میں یہ زبان اردو ہی ہوسکتی ہے جو ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور پاکستان کے کسی خاص خطے کی زبان نہیں اسے مرکزی سطح پر مشترک معاملات و مشکلات کو سلجھانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کا وجود ہمیں قومی اتحاد اور سالمیت کی منزل تک پہنچنے میں معاون بھی ہوگا۔ اس کی ترقی علاقائی زبانوں کی اپنے مخصوص حلقوں میں ترقی کے راستے میں حارج نہیں ہوسکتی۔ جن علاقوں میں اسے سرکاری یا غیر سرکاری معمولات کی زبان کے طور پر اختیار کیا گیا ہے یا جن میں ایسا کر لینے کے حق میں فیصلہ ہوا ہے ان سے تعرض کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا فیصلہ ایک وحدت خیز عامل ہے۔

فیض صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ سیاسی یا معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ کلچر کے تصورات اور اس کی اشکال بدلتی رہتی ہیں یا بدلتی رہنی چاہئیں۔ کیونکہ کلچر نہ جامد شے ہے نہ اسے دوام حاصل ہے۔ میں تبدل و تغیر کا قائل ہوں۔ لیکن اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اربابِ بست و کشاد اور اہلِ فکر و نظر کو اس بات کا اہتمام لازم ہے کہ ایک نظریاتی ریاست میں یہ تبدیلیاں نظامِ معاشرہ کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ ہوں ورنہ اس مملکت کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اس بارے میں تاریخ سے استدلال کرتے وقت یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مغرب میں دین و ریاست کی دوئی کی اپنی ایک تاریخ ہے جو علاقائی قومیتوں کی عاقبت نا اندیش مسابقت میں ڈھل کر رنگ لائی۔

اس تنگ نظر ہوس آلود مسابقت کا ثمر ہم دنیا کی دو عظیم جنگوں کی ہولناک صورت میں دیکھ چکے ہیں۔ ان کے اثرات اب تک ہمارے لیے فکر و عمل کی دنیا میں سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں۔ مجھے فیض صاحب کے قول سے اتفاق ہے کہ کلچر اور ریاست کے حدود ضروری نہیں کہ یکساں ہوں۔ فروعاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ہمارے اور دیگر اسلامی ممالک کے درمیان بنیادی ثقافتی عناصر مشترک ہوں گے۔ اگرچہ ہماری جغرافیائی

سرحدیں الگ الگ ہیں۔ گویا علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

خیمہ ہائے ما جدا دِلہا یکے است

وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ خاکِ پاکستان کے ذرّے ذرّے کی حفاظت میں تن من دھن قربان کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ کیونکہ یہ ملک ہمارا مسکن ہے، ہماری عزیز ترین امیدوں کا گہوارہ اور اسلامی اقدار کا حصار ہے۔ لیکن ہماری وطن دوستی اصولوں سے مستنیر ہو گی نہ کہ دیس کی مٹی کی اندھی پوجا سے۔ اگرچہ سیاسی لحاظ سے ہم ایک نیا ملک ہیں تاہم قومی تاریخ کی نسبت سے ہم ایک پرانی ثقافت کے اصولوں کے علمبردار ہیں۔

فیض صاحب کے خیال میں پاکستان کے ظہور کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہم ہڑپہ، ٹیکسلا اور موئن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ پر فخر کرنا سیکھیں۔ یہ آثار بے شک خطۂ پاکستان کی ثقافتی تاریخ کا حصہ ہیں اس لیے ہم ان کا علمی سطح پر مطالعہ کریں گے اور ان کے دریافت شدہ نوادرات کو حفاظت سے اپنے عجائب گھروں میں سجائیں گے تاکہ تاریخِ عتیق کے عالموں اور سیاحوں کے لئے سہولت ہو۔ لیکن جہاں تک ان سے قلبی لگاؤ اور ان پر جذباتی افتخار کا سوال ہے فیض صاحب کا خیال محلِ نظر ہے۔ یہ آثار و نوادرات ایسے معاشرے یا معاشروں کی باقیات ہیں جو الحاد یا شرک سے ملوث تھے اور اس لیے ہماری اسلامی نفسیات کا تقاضہ ہے کہ ان کو دل میں جگہ دینے کی بجائے طاقِ تحف پر رکھ کر ان سے علم کی حد تک استفادہ کریں۔ اس کلیۃ کی روشنی میں ہم انھیں اپنی موجودہ قومی ثقافت کا حصہ قرار نہیں دے سکتے۔ قومی ثقافت اور اس خطۂ ارض کی ثقافتی تاریخ میں فرق بدیہی ہے۔

اس تفریق کو واضح کرنے کے لیے شاید ایک مثال کافی ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان غاروں میں بود و باش رکھتا تھا۔ جانوروں کا شکار کر کے اوقات بسر کرتا تھا اور بڑے جانوروں کی ہڈیوں کو بطور آلۂ شکار یا ضرب استعمال کرتا تھا۔ اس ابتدائی دور کے طریقِ زندگی کو آج کل کی کوئی قوم یا کوئی ملک اپنی ثقافت میں شامل نہ سمجھے گا۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ملکی تاریخ کے ہر دور

کی باتیات کو ہم اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھیں جبکہ اس دور کی زندگی کے ترکیبی عناصر ہماری موجودہ اساسیات سے مختلف ہوں! ایسی صورت حالات میں اگر کوئی وجہ افتخار ہو سکتی ہے تو یہ کہ نسلِ انسانی ترقی کی منزلیں طے کر کے اس ابتدائی دور سے علمی، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔

اوراقِ فیض
اور
حسنین کاظمی

فکری جمود نہ قوم کے لیے کوئی اچھی علامت ہے نہ فرد کے لیے۔ حرکت زندگی کا لازمہ ہے۔ فکر کی تحریک قوم میں زندگی کا ثبوت ہے اور غور و فکر میں باہمی اختلاف رائے اس زندگی کی پہچان ہے۔ اگر اس کا مقصد اعلیٰ عقائد اور مقاصد کی جانب قوم کی رہنمائی ہو تو یہ اختلاف تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے نتیجے میں قوم ذہنی انتشار کا شکار ہو کر گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ اُس میں فکر و عمل کا اتحاد باقی نہیں رہتا اور وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے محروم ہو کر پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر خود ہی اپنی بداعمالیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران کچھ اعلانات ہوئے تھے۔ کچھ باتیں بآوازِ بلند کہی گئی تھیں۔ ان اہم باتوں میں ایک بات یہ تھی کہ مسلمان برصغیر میں اپنی ثقافت اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لیے اِسی سرزمین کے ایک حصّے پر اپنی خود ارادیت کے اظہار کا حق رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ہمہ گیر اور علاقائی عصبیتوں سے بلند تر اعلانات کی وجہ سے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو پورے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنا مطمحِ نظر بنایا تھا۔ جب ہم نے اپنے آپ کو ایک قوم کہا تھا تو اس میں یہ بات شامل تھی کہ ہمارا تمدن، ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب برصغیر کی اکثریتی قوم کی تہذیب و تمدن اور ثقافت سے مختلف ہے۔ اِس پس منظر میں اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ پاکستان میں تہذیب و تمدن اور ثقافت کا مسئلہ کوئی دریافت اور تصفیہ طلب امر نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں اس مسئلے کو "موضوعِ سخن" نہ بنایا جائے اور اس میں اختلافی باتیں پیدا نہ ہوں۔ یہ مسئلہ ہماری اجتماعی زندگی کے مسائل میں سے ایک ہے اور اس پر گفتگو کا مطلب بھی یہ ہے کہ اسے اہم سمجھا جا رہا ہے۔

یہاں مختصر الفاظ میں یہ اظہار بھی ضروری ہے کہ ثقافت یا تمدّن کا مفہوم کیا ہے۔ کلچر کا لفظ بھی اب اردو میں استعمال ہونے لگا ہے لیکن اردو میں اس لفظ کے ہم معنی الفاظ ثقافت یا تمدن سمجھے جاتے ہیں۔ راقم الحروف کے ذہن میں ثقافت یا تمدّن کا مفہوم ہے۔ ایک ایسی فکری اور نظری

اساس بنیں میں عقائد شامل ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں اس بنیاد پر جتنے عملی مظاہرے ہوتے ہیں۔ وہ تہذیب کے دائرے میں آتے ہیں یعنی فکر و عقیدہ ثقافت یا تمدّن اور اعمال تہذیب۔ اب کیونکہ فکر و عمل لازم و ملزوم ہیں لہذا تہذیب و تمدّن اور ثقافت ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیے جا سکتے۔ کسی قوم کا فکری سرمایہ اُس کی ثقافت یا تمدّن ہے اور اس بنیاد پر اس قوم کی اجتماعی کارکردگی اُس کی تہذیبی دولت ــــ اس مضمون میں کلچر اور ثقافت کے الفاظ اسی مفہوم میں استعمال ہوں گے

ثقافت اجتماعی تشخص کی علامت ہے۔ اس کی بنیادیں طرزِ فکر اور اندازِ نظر میں ہوتی ہیں۔ اس میں دائمیت بھی ہو سکتی ہے اور تغیر پذیری بھی۔ دائمیت اس اعتبار سے کہ اس کے بنیادی عناصر نہیں بدلتے جن کا تعلق قومی تشخص سے ہوتا ہے۔ تغیر پذیری اس اعتبار سے کہ اس کی ہیئت مسلسل ارتقاء کی جانب بڑھتی رہتی ہے اور ارتقاء کسی مستقل بنیاد پر اور کسی متعیّن سمت میں ہی ممکن ہے۔

ارتقاء عملِ فطرت ہے اور ارتقاء کی امتیازی صفت گردش کی حدیں توڑ کر تعمیری راہ اختیار کرنا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں یہ عمل سب سے پہلے فکر کو متحرک کرتا ہے۔ اسی لیے معاشرتی زندگی میں عملِ ارتقاء برقرار رکھنے کے لیے قرآن پاک میں قدم قدم پر تدبر اور تفکر کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن ارتقاء اور لاقانونیت میں بیّن فرق ہے اور لاقانونیت ارتقاء کی دشمن ہے۔ لاقانونیت کا رجحان اس فضا میں پرورش پاتا ہے جس میں اندھی تقلید کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیا جائے۔ یہ ایک شدید عمل کا شدید ردِّ عمل ہے۔ انسانی فکر و عمل کے لیے فطری ارتقاء کی راہیں اگر کشادہ ہیں تو لاقانونیت کے رجحانات اجتماعی اعتبار سے پیدا نہیں ہوتے

اگر ہم انسانوں کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا فکری تجزیہ کریں تو ایک حقیقت واضح ہو گی کہ ہر معاشرتی فکر ماہ و سال کی گردش سے گزر کر نئی نسلوں کی نگاہ میں فرسودگی اختیار کرنے لگتی ہے یہ اندازِ نظر ایک ایسی فکر کی ابتدا کا سبب بنتا ہے جو بظاہر نئی معلوم ہوتی ہے لیکن جس کی جڑیں اسی ابتدائی فکر کے عمل اور ردِّ عمل میں ہوتی ہیں اور اس طرح افکار میں ارتقاء کا سلسلہ برقرار رہتا ہے لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ معاشرتی فکر اور انسانی زندگی کی بنیادی اور اعلیٰ اقدار میں فرق ہے۔ یہ اعلیٰ اقدار معاشرتی فکر سے پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کا منبع وہی ہے جو قوانین قدرت اور قوانین فطرت کا ہے۔ جس طرح قوانین قدرت معاشرتی فکر سے

پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کا منبع وہی ہے جو قوانین قدرت اور قوانین فطرت کا ہے جس طرح قوانین قدرت معاشرتی تفکر سے پیدا نہیں ہوتے۔ اُسی طرح زندگی کی اعلیٰ قدریں بھی اِس فکر کی رہینِ منّت نہیں ہیں لیکن انسانی فکر اُن اقدار کی سچائی کا اعتراف ضرور کر لیتی ہے۔

کوئی ملک ایسا نہیں جہاں علاقائی ثقافت کی نیرنگیاں نہ ہوں لیکن وہ نیرنگیاں ملکی ثقافت کی اکائی بنانے میں معاونت کرتی ہیں، اِس میں انتشار پیدا نہیں کرتیں۔ بڑے ملکوں میں یہ نیرنگیاں بڑے پیمانے پر اور چھوٹے ملکوں میں چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہیں۔ تشخص اور انفرادیت انسان کی بنیادی صفت ہے، اسی کا اظہار اجتماعی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ ملکوں کی بات تو الگ ہے بڑے شہروں کے تو مختلف علاقوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے۔ تمام انسان یک رنگ ہو جائیں تو زندگی بے مزہ ہو جائے۔ معاشرتی زندگی کی ساری کشش نیرنگی میں ہے۔ قومی ثقافت کی ہمہ گیری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک کو ایک بڑے فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ثقافت تو قومی خود اعتمادی کی علامت ہوتی ہے۔ خود اعتمادی پیدا نہ کرے تو کوئی ثقافتی عمل قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ خود اعتمادی قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ تقلید سے روکتی اور تخلیق پر آمادہ کرتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر ثقافت کا لفظ شرمندۂ معنی ہی رہ جاتا ہے۔ پھر بحث و مباحثے تو بہت ہوتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ ثقافت کی روح اگر باقی رہے تو قومی زندگی میں ہمہ گیر عمل کا ارتقا کبھی نہیں رُکتا۔ زندہ قومیں اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتی ہیں اور یہ آرزو ایسی قوموں کے درمیان صحت مند انداز پر جذبۂ مسابقت بیدار کرتی ہے اور پھر جو قوم انسانی زاویۂ نگاہ سے سب سے بلند مرتبہ حاصل کرے اُس کی ثقافت برتر کہلانے کی مستحق ہے۔

یہاں اسلامی ثقافت سے متعلق کچھ گفتگو بے محل نہ ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی ثقافت کا مطلب کیا ہے؟ کیا اِس کا مطلب ماضی پرستی ہے؟ راقم الحروف کے خیال میں ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے پیمانے ہم نے بنائے ہیں تاکہ سلسلۂ زماں ناپ سکیں۔ یہ تقسیم فطرت کی نگاہ میں نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ وہ سب قدرت کے نزدیک ایک ہمہ گیر "حال" ہے۔ ہم جسے "ماضی" کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں وہ حقیقت

میں ایسے افکار و اعمال ہیں جن میں زندہ رہنے کی سکت نہیں تھی اور اسی لیے اب انسانوں کی دُنیا میں باقی نہیں ہیں۔ "حال"، نسلِ آدم اور اُس کے افکار کی ان کوششوں کا نام ہے جو زندگی میں ترقی کے حصول کے لیے کی جاتی ہیں۔ یہی کوششیں جب تک عملی شکل اختیار نہیں کرتیں بلکہ آرزوؤں اور تمناؤں کی حدود میں ہوتی ہیں "مستقبل" کہلاتی ہیں۔ بجائے خود زندگی تسلسلِ ارتقار کا نام ہے اور اپنی اصل اور حقیقت میں یہ لازوال ہے ؎

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے　　نہ حد اُس کے پیچھے، نہ حد سامنے

قرآن پاک میں زندگی کا تصور یہی ہے اور اس پس منظر کے بغیر اسلامی ثقافت کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسلامی ثقافت دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے حیاتِ اجتماعی کی فکری اساس فراہم کرتی ہے۔ اس ثقافت نے عالمِ انسانیت کے لیے فکر و عمل کی بے شمار راہیں روشن کی ہیں۔ یہ ارتقار کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں جمود کی بندشیں عائد نہیں کرتی۔ یہ ایک تن آور اور مضبوط درخت کی مانند ہے جس کے پھول اور پتے تو بہار اور خزاں کے موسموں سے متاثر ہوتے ہیں لیکن جس کی جڑوں پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسلامی ثقافت کا مطلب یہ نہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک زبان، ایک لباس، یکساں رہن سہن اور ہم رنگ فنون لطیفہ کا پابند بنا دیا جائے۔ اس ثقافت نے انسانی معاشرت کے لیے کچھ اصول فراہم کر دیئے ہیں۔ یہ اصول نہیں بدلتے لیکن ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے ذیلی طریقوں میں فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔

پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ عالمِ انسانیت "اُمّت واحدہ" ہے۔ ان کے درمیان رنگ، نسل اور عزّت و عظمت کا معیار تعارف کے لیے ہے۔ ہر ابنِ آدم قابلِ تکریم ہے اور انسانوں کے مابین عزّت و عظمت کا معیار تقویٰ یا اعلیٰ کردار ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ انسانوں پر جو نظامِ حکومت بھی قائم ہو اُسے ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے انسانوں پر انسانوں کی آرزوؤں اور خواہشات کی نہیں بلکہ انسانوں پر قوانین کی حکمرانی ہو۔ قانون کی بالادستی انسانوں کو فتنہ و فساد سے محفوظ رکھتی ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ دُنیا میں پیداوار کے تمام وسائل ساری انسانیت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ لہٰذا دُنیا کے مختلف علاقوں میں جو نظام بھی قائم ہو اس کا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ تمام انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی فراہم کی جائیں اور ضروریات زندگی میں ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کی نشوونما بھی شامل ہے۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ انسانی ارادے اور اختیار کی صفت قابلِ احترام ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو عقائد کے معاملات میں مکمل آزادی ہونی چاہیئے اور عقائد میں اختلاف کی بنا پر کسی انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اتنا ضروری ہے کہ افراد کے عقائد معاشرتی زندگی میں وجہِ فساد نہ ہوں۔

یہ وہ اصول ہے جو عالم گیر ہیں۔ جو ہر زمانے میں زندہ رہیں گے جو انسانی مستقبل کے کسی دور میں فرسودہ اور از کار رفتہ قرار نہیں دیئے جاسکیں گے جن کے مطابق عمل کی خواہش انسان کے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہے گی۔ جن کے مطابق اجتماعی نظام کی مکمل تشکیل کے لیے انسان کو ابھی فکری اور عملی ارتقاء کی بہت سی منزلوں سے گزرنا ہے۔ یہ اصول زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ علم میں علوم بھی شامل ہیں، فنونِ لطیفہ بھی اور فنی اور تکنیکی ترقیاں بھی، نظام حکومت بھی اور معاشی اور سماجی طور طریقے بھی، رہن سہن کا انداز بھی اور لباس بھی، صنعت و تجارت بھی اور بین الاقوامی تعلقات بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصولوں کے مطابق جزیرہ نمائے عرب میں ایک اجتماعی نظام کے قیام کے بعد مسلمانوں نے جب دُنیا میں پھیلنا شروع کیا تو جہاں جہاں وہ گئے اپنے اثرات چھوڑتے اور نشانات قائم کرتے گئے۔ انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جسے انھوں نے متاثر نہ کیا ہو اور یہ اثرات ایسے تھے جسے غیروں نے بھی بھرپور انداز میں قبول کیا ــــ سائنسی اندازِ فکر و نظر، حریتِ فکر و عمل، علم کی عظمت کا احساس، انسانی مساوات اور احترام کا عالم گیر تصوّر، یہ اور ایسی ہی بہت سی نعمتیں ہیں جو دنیا نے اسلامی ثقافت سے حاصل کی ہیں۔ اسی بنا پر ہم رسالت اور خلافت کے دور کو اپنے لیے اور ساری انسانیت کے لیے آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔

رسالت اور خلافت کا تعلق ماضی سے صرف اس حد تک ہے کہ وہ حقیقت ماضی کے

ایک خاص دور میں وقوع پذیر ہوتی لیکن انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کے مطابق معاشرے کی تنظیم کا جہاں تک تعلق ہے اس اعتبار سے وہ دور ماضی کا نہیں بلکہ مستقبل کا دور ہے۔ ماضی کا تعلق فرسودگی اور موت سے ہوتا ہے۔ یہ دور زندہ و پائندہ ہے کیونکہ ہر دور کے انسان کے لیے مثالی اور قابلِ عمل ہے۔ اجتماعی دور میں اس دور کی صفات پیدا کرنے کے لیے ہمیں ابھی عملی اعتبار سے بہت سے ارتقائی مرحلے طے کرنے ہیں۔ اِسی لیے وہ دور محض ہمارا ماضی نہیں مستقبل بھی ہے ـــــ میرا ماضی میرے استقبال کی تصویر ہے ـــــ ہمارا ماضی مردہ نہیں زندہ ہے، دیومالائی روایات کا مجموعہ نہیں حقیقی ہے ـــــ لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں رسالت اور خلافت کے دور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے تو اس کا مطلب ماضی پرستی یا ازمنۂ وسطیٰ میں لوٹ جانا نہیں بلکہ ان راہوں کو اختیار کرنا ہے جو اس معاشرتی عمل نے انسانیت کے اجتماعی فلاح اور حریتِ فکر کے لیے کشادہ کی ہیں۔ اس طرح حقیقی ارتقاء کا حصول ممکن ہو جائے گا۔ رسالت اور خلافت کے دور کا تعلق ماضی سے صرف اس حد تک ہے کہ دین نے انسانی معاشرت کے جو نظری اصول پیش کئے ہیں انھیں محض آئیڈیل اور اس اعتبار سے ناقابلِ عمل نہ سمجھ لیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ نے قول و عمل کی مکمل ہم آہنگی کا بے مثال تاریخی ثبوت اس لیے پیش فرمایا کہ آنے والے زمانوں میں انسانوں کے لیے عمل نہ کرنے کا کوئی جواز نہ رہے اور جو لوگ عمل کرنا چاہیں ان کے لیے وہ دور بطور مثال سامنے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالت اور خلافت کا دور انسانیت کے مستقبل کا دور ہے انسان معاشرتی عظمتوں کے حصول کے لیے اپنے اندر جن صفات اور خصوصیات کو پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ اس دور کی صفات اور خصوصیات سے علیحدہ نہیں ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی جن ملکوں نے یا جن قوموں نے جس حد تک اُن اصولوں پر عمل کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے وہ اُسی حد تک زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

وہ نظریۂ حیات جسے ہم اسلام کہتے ہیں ہمارے لیے اجتماعی زندگی کی فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس فکری بنیاد پر دُنیا کے مختلف علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں نے اپنی زندگیاں کس طرح مرتب کیں۔ یہ علاقائی یا ملکی نیرنگیوں کی بات ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی یہ کہ اسلامی ثقافت اور عرب ثقافت میں فرق ہے۔ اسلامی نظامِ فکر کا پہلا اور مثالی تجربہ سرزمین عرب پر ہوا اس

لیے بظاہر اسلامی اور عرب ثقافتیں ہم معنی نظر آتی ہیں۔ پھر ایران نے بھی اُسے اجتماعی طور پر قبول کر لیا۔ ایران بھی اسلامی ثقافت کا مرکز بن گیا۔ لیکن ایرانی تہذیب کی انفرادیت برقرار رہی۔ عرب اور ایران کے ملے جلے اثرات برصغیر تک جب پہنچے تو یہاں ایک اور نظامِ فکر سے اُن کا سامنا ہوا۔ یہ وہ طریقۂ زندگی تھا جو آریوں کے ساتھ برصغیر میں آیا تھا اور اس نے تقریباً اس پورے علاقے کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا تھا۔ اُسے ہندوازم کہا جاتا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کے تسلط سے پہلے تقریباً سو سال مسلمانوں نے حکومت کی اور برصغیر کی تہذیب پر اپنے بھرپور اثرات مرتب کئے لیکن ایک نظامِ فکر کے اعتبار سے یہاں اسلام اور ہندوازم دونوں برقرار رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اقتدار کے دور میں اپنی حاکمیت کی قوت کا سہارا لے کر ہندوازم کو فنا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن جب اعداد کی بنیاد پر حکومت میں حصّہ داری کا امکان پیدا ہوا تو مسلمانوں کو قدم قدم پر یہ احساس دلایا گیا کہ ان کی اپنی انفرادیت کے لیے آزاد برصغیر میں کوئی جگہ نہ ہو سکے گی۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل ڈھائی سالہ کانگریسی اقتدار کے تجربے نے ہندی مسلمانوں کے تمام اندیشوں کو ہر ممکن طریقے سے تقویت پہنچائی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں ایک یہ کہ وہ اپنی انفرادیت کا خیال چھوڑ دیں۔ دوسرے یہ کہ اُسے برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ انھوں نے جدوجہد کا نہایت دشوار راستہ اختیار کیا۔

حصولِ پاکستان کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد کسی وقتی یا جذباتی انتشار کا نتیجہ نہیں تھی۔ صدیوں کا تاریخی تسلسل اس جدوجہد کی صداقت کی تصدیق کر رہا تھا۔ مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ تاریخ، تعداد اور افکار و اعمال کے اعتبار سے وہ برصغیر میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اِس حیثیت کو کثرت کے سیلاب میں ختم ہوتا دیکھتے رہیں۔ اس جدوجہد کو پورے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنایا اور اسی کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا۔

اتنی بات ضرور ہے کہ پاکستان جب قائم ہوا تو نام کے اعتبار سے یہ ملک نیا تھا۔ نام کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر میں یہ ایک نئے تجربے کی علامت بھی تھا۔ اس کے سوا پاکستان کی کوئی چیز نئی اور غیر مانوس نہیں تھی۔ زندگی اور اس کے ہر پہلو سے متعلق ہماری فکر اور ہمارے عقائد اور پھر ہمارے تاریخی تجربات، یہ سارا سرمایہ ہمارے پاس تھا جب پاکستان بنا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ فکری اعتبار سے، عقائد

کے اعتبار سے اور تاریخی اثاثے کے اعتبار سے پاکستان کا قیام برصغیر کی مسلمان قوم کے لئے نقلِ مکانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہمارے اجتماعی تشخص کی وہ ساری علامتیں جو آزاد ہندوستان میں محفوظ نہ رہتیں انہیں پاکستان میں محفوظ رہنا تھا۔ پاکستان کی ثقافت سے متعلق گفتگو میں یہ پس منظر نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر ذہنی انتشار کے سوا کچھ اور حاصل ہونا مشکل ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی وساطت سے گذشتہ سال ملک کی تین اہم علمی اور ادبی شخصیتوں نے پاکستان کے ثقافتی مسائل پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ جناب فیض احمد فیض، پروفیسر کرار حسین اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی فکر انگیز گفتگو سے ملک کے مختلف حصّوں میں مختلف انداز میں اس موضوع پر خیالات کے اظہار کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں کبھی کبھی تلخی کا رنگ بھی نمایاں ہوا۔ اس سلسلے میں محترم فیض صاحب کے خیالات زیادہ تر موضوعِ گفتگو بنے رہے۔ فیض صاحب کو شکایت یہ پیدا ہوئی کہ اس مباحثے میں ان سے بعض ایسی باتیں منسوب کر کے ہدفِ تنقید بنائی گئیں جو انہوں نے نہیں کہی تھیں۔ چنانچہ سہ ماہی جریدے "غالب" کے دوسرے شمارے میں انہوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات ایک مختصر لیکن جامع مضمون میں واضح کئے ہیں۔ فیض صاحب کا نام کیونکہ ایک خاص اندازِ فکر رکھنے والوں میں سب سے زیادہ معتبر ہے لہٰذا یہ سمجھنا نامناسب نہیں ہوگا کہ ان کے خیالات اس اندازِ فکر کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔

فیض صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ "کلچر زندگی کے جملہ کاروبار پر انداز ہوتا ہے۔ پورے طریقۂ زندگی کو کلچر کہتے ہیں ـــــ اس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی دونوں تفاصیل شامل ہوتی ہیں"۔ لیکن اس سے اگلے پیراگراف میں فیض صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا جو گذشتہ جملوں میں ادا کیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے "معاشرے کا جو ڈھانچہ ہوگا، اس کی جیسی ہیئت ترکیبی ہوگی یا جیسا سوشل اسٹرکچر ہوگا، کلچر تمام تر اس کے تابع ہوگا"۔ اس سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کلچر اگر "پورا طریقۂ زندگی" ہے، "معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے" اور اس میں "زندگی کی ظاہری اور باطنی دونوں تفاصیل شامل ہیں"، تو پھر یہ سوشل اسٹرکچر یا اس کی ہیئت ترکیبی کے تابع

نہیں ہوگا بلکہ خود اس کی ترتیب و تشکیل و تنظیم کرے گا۔

اس کے بعد فیضؔ صاحب نے فرمایا ہے "کلچر نہ کوئی جامد شے ہے، نہ اسے دوام حاصل ہے۔" یہ بات تو درست ہے کہ کلچر کوئی جامد شے نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے تمام کلچر ایسے ہوں جنہیں دوام حاصل نہ ہو لیکن راقم الحروف کے خیال میں اسلامی کلچر کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ شے جسے دوام حاصل ہو ضروری نہیں کہ جامد بھی ہو۔ قوانینِ فطرت جامد نہیں لیکن انہیں دوام حاصل ہے۔ لہٰذا اگر کسی کلچر کے بنیادی اجزاء معاشرتی زندگی کے لئے قوانینِ قدرت کی حیثیت رکھتے ہیں تو اسے قوانینِ قدرت جیسا دوام حاصل ہو سکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی نظامِ فکر میں ثبات اور تغیر کا بڑا مکمل اور لطیف امتزاج ہے۔ اس میں اقدارِ حیات کی بنیاد دائمی ہے۔ ان اقدار کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں انسان کی معاشرتی تنظیم کے طور طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک یہ دائمی اقدار ہی ہماری ترقی کا معیار اور پیمانہ ہیں کیونکہ جیسا پہلے عرض کیا گیا ارتقاء کسی مستقل بنیاد پر اور کسی متعیّن سمت ہی میں ممکن ہے۔ ایسا نہ ہو تو زندگی کے کسی ایک پہلو کا ارتقاء کسی دوسرے پہلو کا تنزل بن جاتا ہے۔

اس کے بعد فیضؔ صاحب نے فرمایا ہے "برّصغیر کی تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت ایک نوع کی تھی۔" یہ بات بڑی اہم ہے جس کی تصدیق فیضؔ صاحب نے فرمائی ہے۔ انہوں نے ہماری قبل تقسیم کی صرف "سیاسی کیفیّت" ہی کو نہیں بلکہ "معاشرتی کیفیّت" کو بھی "ایک نوع" کا قرار دیا ہے۔ کچھ اور آگے جا کر پاکستان کے مختلف علاقوں کی بات کرتے ہوئے بھی انہوں نے یہ یاد دلایا ہے کہ "ان میں بہت سے بنیادی مشترک اجزاء ہیں جو ہمارے قومی کلچر کی اساس ہیں۔ ان میں سب سے اہم عنصر اشتراکِ دین ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مشترک اجزاء کا ایک سبب جغرافیائی قربت ہے اور دوسرا سبب یکساں تاریخی تجربات۔" اس طرح ہمارے کلچر کی وحدت میں جو عوامل کی سیاسی اور معاشرتی کیفیّت"، "جغرافیائی قربت" اور "یکساں تاریخی تجربات" ہیں ——— یہی وہ بنیادیں ہیں جو کسی بھی فکری وحدت کے لئے سب سے زیادہ اہم ہیں اور یہ اظہار در اصل

اس زاویۂ نگاہ کی صداقت کا اعتراف ہے جس کی بنیاد پر پاکستان کے قیام کا مطالبہ ہوا تھا لیکن ان ہی حقائق کے اظہار کے دوران فیض صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "پاکستان" بننے کے بعد اس (سیاسی اور معاشرتی کیفیت) میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اور اسی کے مطابق ہمیں اپنے کلچر کا تصور کرنا چاہیئے تھا جو اب تک ہم نے نہیں کیا۔" یہ بنیادی تبدیلی فیض صاحب کے مطابق یہ ہے کہ۔ "برصغیر کی تقسیم سے ایک نیا ملک وجود میں آیا پاکستان اور ایک نئی قوم وجود میں آئی۔ پاکستانی قوم"

یہ بات تو بالکل درست ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد ایک نیا ملک وجود میں آیا لیکن یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ اس طرح ایک نئی قوم بھی وجود میں آئی ــــ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ملک کے وجود کے بعد قوم وجود میں آئی تو سب سے اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خود یہ ملک کس طرح وجود میں آیا اور اِسے کون وجود میں لایا ؟ یہ ملک کسی حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ملک تدبر اور تفکر کے بعد ارادے اور اختیار کو کام میں لا کر قائم کیا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو درحقیقت یہی بات سارے مسائل کی بنیاد ہے اور بات یہ ہے کہ بہ حیثیت مسلمان ہماری قومیت کا اصل کیا ہے ؟ ہمارا تصورِ قومیت کیا ہے اور پاکستان کے قیام اور اس کے استحکام سے اِس کا کیا تعلق ہے ؟

یہ واقعہ ہے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد جو لوگ اِن علاقوں میں رہتے تھے یا جو اپنی مرضی سے آکر آباد ہوئے وہ دُنیا میں اپنی شناخت کے لیے پاکستانی کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ ذیلی شناخت ہماری بڑی اور زیادہ اہم شناخت کی راہ میں حائل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اقبال نے مغرب کے تصور کو ایک بُت قرار دیا ہے اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر جو بات اُنھوں نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ؎

"اِسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے"

اِس کا یہ مطلب کسی صورت نہیں نکلتا کہ مسلمان کو اپنے وطن سے محبّت نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہماری قومیت کی بُنیاد فکری اور نظریاتی ہم آہنگی ہے۔ یہ مسئلہ لفظی مفہوم اور مطلب میں بحث مباحثے کا نہیں ہے۔ انگریزی میں "نیشنیلٹی" اور

اردو میں قومیت سے آپ جو یہ مفہوم لیتے ہیں اس میں ہمارا موقف یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارے اتحاد کی بنیاد جغرافیائی حدود سے بلند تر ہے۔ ہم چھوٹے مفاد کو بڑے مفاد پر قربان کر دینے کا سبق پڑھ چکے ہیں۔ ہماری وفاداریوں کا احاطہ اپنے گھر کی مختصر سی اکائی سے شروع ہو کر ساری انسانیت کو اپنے محیط میں لے لیتا ہے۔ ہم گھر کے مفاد کو خاندان کے مفاد پر، خاندان کے مفاد کو قبیلے کے مفاد پر، قبیلے کے مفاد کو علاقے کے مفاد پر، علاقے کے مفاد کو ملک کے مفاد پر اور ملک کے مفاد کو عالم اسلام یا عالم انسانیت کے مفاد پر قربان کر سکتے ہیں۔ ہمارے نظریے کے مطابق جسمانی یا حیوانی سطح پر جو اہمیت خون کے رشتے کی ہے وہی اہمیت انسانی سطح پر فکر، عقیدے اور ایمان کے رشتے کی ہے۔ برصغیر کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی ہر قیمت پر بھرپور حمایت کر کے اسی رشتے کی اہمیت کی تصدیق کی تھی۔ یہی انسانی سطح کا حقیقی رشتہ ہے۔ اسی حقیقت کی عملی تفسیر کے لئے پاکستان قائم ہوا ہے۔ اس کے سوا پاکستان پر مشتمل علاقوں کی برصغیر سے علیحدگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے بغیر پاکستان کے قیام کی وجوہ سمجھی نہیں جا سکتیں۔ پاکستان کے استحکام کو مقصدِ حیات بنایا نہیں جا سکتا۔

مسلمانوں کے لئے قومیت یا ہمہ گیر اجتماعیت کا یہ تصور نیا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صدیوں تک مغربی افکار کی کورانہ تقلید کی وجہ سے یہ تصور دھندلا پڑ گیا تھا۔ مسلمانوں پر ابتلا اور آزمائش کی صدیاں گزری ہیں۔ ایک سمت اسلام کے نام پر صدیوں تک سرمایہ دارانہ اور شاہانہ نظام، دوسری سمت مغربی اقوام کی اقتصادی اور سیاسی غلامی۔ اسی لئے ہم بکھر کر رہ گئے ہیں۔ اب دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمِ اسلام میں نئی زندگی اور بیداری کے کچھ آثار پیدا ہوتے ہیں اس کا سہرا ابھی برصغیر کے مسلمانوں کے سر ہے جنہوں نے "قومیتِ اسلام" کے تصور کی ایک طرح سے بازیافت کی اور قیام پاکستان سے اس تصور کے بازیافت کی تصدیق ہو گئی۔

فیض صاحب نے اپنے اس مضمون میں دو باتیں اور بڑی قابلِ قدر کہی ہیں لیکن ان باتوں کی تفصیل انہوں نے جس طرح بیان کی ہے اور اس کے جو نتائج نکالے ہیں ان سے اتفاق کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلم قومیت کا وہ تصور جو قیام پاکستان کا سبب بنا تھا اس کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ایک بات تو فیض صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ کلچر اور

ریاست کے حدود عام طور سے یکساں نہیں ہوتے۔" اور دوسری بات انہوں نے اپنے مضمون کے آخری پیراگراف میں یہ کہی ہے، کہ "تہذیبی معاملات میں ہمیں کنوئیں کا مینڈک نہیں بننا چاہیئے جہاں جہاں سے ہمیں جو کچھ ملا ہے اسے رد کرنے اور اسے اپنی تہذیب سے خارج کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" یہ دونوں باتیں بڑی اہم ہیں اور فیض صاحب کی وسیع النظری کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن پاکستان کے ثقافتی مسائل پر ان اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے انہوں نے قومیت کی صرف وہی تعریف پیشِ نظر رکھی ہے جو اہلِ مغرب کی سیاست نے متعیّن کی ہے۔

فیض صاحب نے درست فرمایا ہے کہ "کلچر اور ریاست کے حدود عام طور پر یکساں نہیں ہوتے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ کلچر کو جغرافیائی حدود کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ پاکستان کے ثقافتی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کلچر کی اس صفت کو پیشِ نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ فیض صاحب نے بھی یہ خیال رکھا ہے جب انہوں نے تحریر فرمایا کہ "بلاشبہ ہمارے تہذیبی ورثے میں دہلی اور آگرہ اور میر و غالب بھی شامل ہیں۔ اسی طرح سمرقند و بخارا اور حافظ و سعدی اور رومی بھی شامل ہیں۔ لیکن "تھوڑی سی" تفریق بھی لازم ہے اُن تہذیبی مظاہر و آثار میں جو اس وقت ہماری سرزمین میں موجود ہیں اور اُن مظاہر و آثار میں جو اس سرزمین کے باہر ہیں۔" بات اگر "تھوڑی سی" تفریق کی رہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس "تھوڑی سی" تفریق کی جو وضاحت فیض صاحب نے فرمائی ہے وہ اسے ایک بڑے فرق میں تبدیل کر دیتی ہے۔

فیض صاحب نے فرمایا ہے کہ "پاکستان بننے کے بعد ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس سرزمین سے جو کچھ متعلق ہے یعنی یہاں کے آثار، علوم و فنون وغیرہ ان پر فخر کرنا سیکھیں۔ اس اعتبار سے "ہمارے بنیادی خیالات میں ایک ترمیم کی ضرورت ہے"، جو یہ ہے کہ پاکستان معاشرہ غیر منقسم ہندوستان کا معاشرہ نہیں ہے اور نہ پاکستانی قوم غیر منقسم برِّصغیر کی مسلم قوم ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے اور پاکستانی قوم ایک نئی قوم ہے۔" اس وضاحت میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ فیض صاحب "ہمارے بنیادی خیالات میں ایک ترمیم کی ضرورت" پر سب سے زیادہ زور دے رہے ہیں۔ ممکن ہے فیض صاحب کے ذہن میں یہ بات نہ ہو

لیکن راقم الحروف کے خیال میں "بنیادی خیالات میں ایک ترمیم" کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان مقاصد میں بھی ترمیم کی جائے جو اس وقت من حیث القوم ہمارے پیش نظر تھے جب حصولِ پاکستان کی جدوجہد ہو رہی تھی۔ اور اس ترمیم کا مطلب یہ ہوگا کہ خود پاکستان میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی۔

جہاں تک اس سرزمین سے محبت کا سوال ہے جو پاکستان کی سرحدوں میں شامل ہے اس محبت کا ثبوت تو اسی وقت بھرپور انداز میں مہیا کر دیا گیا تھا جب اسے پاکستان کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا۔ محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنے صدیوں کے آبائی وطن کی محبت کو قربان کر دیا۔ برِصغیر میں تقسیم کے بعد نقلِ مکانی جو ہوئی وہ نہ کوئی امر اتفاقی تھا نہ مسئلۂ مجبوری۔ اس میں ارادوں کا پورا دخل تھا۔ جو لوگ تقسیم کے بعد یہاں آکر آباد ہوتے ہیں وہ اپنے آبائی وطن سے اپنے نظریاتی وطن کی جانب آئے ہیں، اب اس میں "ترمیم" تو صرف اسی انداز میں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کو نظریاتی وطن نہ سمجھا جائے بلکہ صرف جغرافیائی وطن قرار دیا جائے۔ اور پھر محض جغرافیائی بنیادوں پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ اپنا کون ہے اور غیر کون ہے؟ اپنی کیا چیز ہے اور پرائی کیا چیز ہے؟ ہم کس پر فخر کریں اور کن کن پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔؟

ممکن ہے محترم فیض صاحب نے ترمیم کا جو مشورہ دیا ہے وہ ان کے خیال میں حبِ وطن کے بنیادی تقاضوں کے دائرے میں آتا ہو لیکن اس مشورے کا یہ پہلو شاید ان کے پیشِ نظر نہیں رہا کہ اس سے ایک پوری تحریک اور ایک پوری تاریخ کی نفی ہو جائے گی۔ پاکستان میں برِصغیر کی پوری مسلم قوم آکر آباد نہیں ہوئی۔ شاید کبھی بھی نہ ہو سکے لیکن اسے حاصل کیا ہے۔ پورے برِصغیر کی مسلم قوم نے۔ اس پر حق سب کا یکساں تھا۔ یہ حق یکساں انداز میں سب کو مل تو نہیں سکتا تھا لیکن اس کا اعتراف انصاف اور تاریخ دونوں کا تقاضا ہے۔ اس اعتراف سے اقلیتی صوبوں میں رہ جانے والے مسلمان پاکستان کی زمینوں، نوکریوں یا صنعت و تجارت میں حصے دار نہیں بن جائیں گے، لیکن وہ راہ روشن ضرور رہے گی جو اس ملک کے لئے امن و سلامتی اور فلاح کی ضامن ہے۔

اس بات کو ایک اور انداز سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر برِصغیر کی تقسیم نہ ہوتی اور یہ سارا علاقہ ایک واحد ملک کی صورت میں آزاد ہوتا تو کیا اس حیثیت میں اس ملک کی کوئی ثقافت ہوتی ؟ بلاشبہ اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دیا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں کسی ثقافت کی بازیافت یا تشکیلِ نو کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ غیر منقسم برِصغیر میں علاقائی ثقافتوں کا مسئلہ کبھی موضوعِ بحث نہیں بنا کیونکہ علاقائی ثقافتوں کو برِصغیر میں کسی وقت کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ وہاں مسئلہ مسلم ثقافت اور ہندو ثقافت کا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی ثقافت کے تحفظ کے لئے پاکستان بنا لیا۔ اب یہ بات بڑی عجیب سی ہے کہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو پورے برِصغیر کی نمائندہ ثقافت قبول کر لی جاتی لیکن تقسیم ہو جانے کی صورت میں برِصغیر کی مسلم ثقافت قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ خیالات میں "بنیادی ترمیم" کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ "تھوڑی سی تفریق" لازم قرار دی جا رہی ہے ان آثار و مظاہر میں جو اس سرزمین میں ہیں اور وہ جو اس سے باہر ہیں۔ "اپنی ملکیت" اور "دوسرے کے مال" میں فرق واضح کیا جا رہا ہے کہ "دوسرے کے مال" کو اگر اپنا کہا تو ہم "طفیلی" بن جائیں گے۔

محترم فیض صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کرنا ہے کہ بات تو اس سے آگے کی بھی ہو سکتی ہے لیکن کم از کم پورے برِصغیر کی حدود تک تو ثقافت کے مسئلے میں جو کچھ ہے سب کا سب ہمارا ہے یعنی برِصغیر کی مسلم قوم کا ہے، جس نے اس کی حفاظت کے لئے پاکستان بنایا ہے۔ یہاں کوئی مال "دوسرے کا مال" نہیں اور اسے اپنا لینا ہمارا تاریخی حق ہے۔ اس میں "طفیلی" بن جانے کا سوال نہیں۔ فیض صاحب نے تو خود ہی فرمایا ہے کہ "کلچر اور ریاست کے حدود عام طور سے یکساں نہیں ہوتے"۔ اسی صورت سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ثقافتی ملکیت اور جغرافیائی ملکیت میں فرق ہوتا ہے۔ بہت سی وہ چیزیں جو ہمارے ملک کی جغرافیائی حدود میں نہیں، ہماری ثقافتی ملکیت میں شامل ہیں اور بہت سی وہ چیزیں جو ہماری جغرافیائی حدود کے اندر ہیں انہیں ہم اپنی ثقافتی ملکیت نہیں کہہ سکتے۔ نظری اور فکری ہم آہنگی کو اگر ثقافتی وحدت کی بنیاد قرار دے دیا جائے تو نہ تو جغرافیائی حدود اس میں حائل ہوتی ہیں اور نہ محض علاقائی تسلسل کی بنیاد پر ہم اثارِ قدیمہ کے سارے نوادرات کو اپنا ثقافتی ورثہ قرار دے سکتے ہیں۔ اگر

برصغیر میں اجنتا اور ایلورا مسلم قوم کا ثقافتی ورثہ نہیں تھا تو پاکستان میں موہن جوڈارو اور ٹیکسلا بھی ہمارا ثقافتی ورثہ نہیں ہیں۔ یہ بات ہمارے لئے خوشی کی ضرور ہے کہ موہن جوڈارو اور ٹیکسلا پاکستان کی سرزمین میں ہیں۔ لیکن اگر ہماری ثقافت کا ان سے کوئی تاریخی رشتہ نہیں ہے اور بقول پروفیسر کرار حسین کہ جو چیزیں کھود کر نکالی جائیں اور شیشے کی طرح بچائی جائیں وہ عجائب خانے کی چیزیں تو ہیں لیکن ہماری زندگی سے اب براہِ راست ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ثقافت اور نظریے کے باہمی تعلق کو ایک اور انداز سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس صدی میں ایک ہی نظریے کی بنا پر دو بہت عظیم انقلابات آئے ہیں۔ ایک انقلاب روس میں آیا۔ اس کے تقریباً ۳۰ سال بعد اسی بنیاد پر دوسرا انقلاب چین میں آیا۔ روس اور چین دنیا کے بہت بڑے ممالک ہیں۔ ان کی بہت طویل تاریخ ہے اور اس میں فخر و مباہات کے بھی بے شمار مواقع ہیں لیکن زار کے زمانوں کی باقیات پر اشتراکی روس فخر نہیں کرتا اور چین کو اپنے نظریے کی بقا کے لئے ایک پورا ثقافتی انقلاب لانا پڑا۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں روس اور چین کے اربابِ اقتدار اور اہلِ علم پر اگر کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ درست نہیں ہو گا۔ اسی سلسلے کا ایک اور پہلو ہے۔ ہم پاکستانیوں کے لئے اور خود محترم فیض صاحب کے لئے یہ بڑا اعزاز تھا کہ انہیں لینن پرائز ملا۔ ظاہر ہے خود فیض صاحب بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ روس کی جانب سے ان کی ادبی عظمت کے اعتراف میں فکری ہم آہنگی کا کوئی دخل نہیں تھا۔؟

اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں ثقافت کی یہ ساری باتیں اور یہ سارے مسائل اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ آزادی کے ۲۲، ۲۳ سال ہم نے فکری انتشار کی صحرانوردی میں ضائع کر دیئے۔ قیامِ پاکستان کے تقریباً ۲۳ سال بعد ہی یہاں حالات میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور یہاں ایسے لوگ برسرِ اقتدار آ گئے جن کا پاکستان کی تحریک یا برصغیر کی مسلم قوم کی تاریخ سے کوئی فکری رشتہ نہیں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ ان کی کوئی بھی فکری بنیاد تھی ہی نہیں سوائے اس فکر کے کہ وہ کس طرح اقتدار حاصل کریں اور اسے کس طرح قائم رکھیں۔ اربابِ اقتدار کے اس ظالمانہ قسم کے خود غرضانہ رویے نے عام آدمی کو رفتہ رفتہ اس حد تک ذہنی

اور فکری انتشار میں مبتلا کیا کہ قوم کا سارا جذبۂ عمل اور ساری توانائیاں ضائع ہوتی چلی گئیں۔
اور اب جو ثقافتی اور تہذیبی مسائل کی بات شروع ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کسی تاریخی حادثے کی بنا پر وجود میں آگیا تھا جس میں متضاد خیالات، مفادات اور مقاصد رکھنے والے کسی طرح یکجا ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اب جبکہ ساتھ رہنا ناگزیر ہو گیا ہے تو اچھا ہے چند مشترک پہلو تلاش کر لئے جائیں۔ جب تاریخ کے رشتے ٹوٹنے لگیں اور ذیلی مفادات کی چوٹ سے اجتماعی یادداشت پراگندگی کا شکار ہو جائے تو نتائج ایسے ہی عبرت انگیز ہوتے ہیں جیسے آج ہمارے سامنے ہیں۔

دنیا میں بہت سی قومیں ہیں، بہت سے افکار و نظریات ہیں لیکن بہ حیثیت مسلمان ہمارا مسئلہ ان سب سے مختلف ہے۔ دنیا میں اسلام ہمارے تشخص کی علامت ہے۔ ہماری پہچان ہے۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے زندگی کے مسائل میں بہت سے سمجھوتے کر لئے ہیں ان کے مذاہب زندہ قوت کی حیثیت سے باقی نہیں رہے لہٰذا جس طرح گھر کی سجاوٹ، خوبصورتی اور اس میں تقدس کا تصور برقرار رکھنے کے لئے لوگ مختلف اشیا سے کام لیتے ہیں، ان قوموں نے اپنی اجتماعی زندگی میں اپنے مذاہب کو ویسی ہی سجاوٹ اور پاکیزگی کا احساس پیدا کرنے والی شے کی جگہ دے دی ہے۔ ان کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوتی، جب وہ انفرادی یا اجتماعی زندگی میں تضادات اختیار کرتے ہیں۔ وہ اسے تضاد سمجھتے ہی نہیں۔ انہوں نے زندگی کو مختلف خانوں، مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ وہ متضاد اعمال کو زندگی کے مختلف شعبوں کا تقاضا سمجھ کر اختیار کئے رہتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ اور بے ایمانی بری صفات ہیں لیکن تجارت میں منفعت اور ذاتی مفاد کے حصول کے لئے ان کو اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ عدل و انصاف اچھی صفات ہیں۔ لیکن اپنی قوم کے لئے دوسری قوم پر ظلم کر لینے کی اجازت ہے۔ ہمارے لئے یہ مسائل اتنے آسان نہیں۔ ہمارا پورا ضابطۂ حیات مکمل طور پر تحریری شکل میں ہمارے پاس ہے۔ ایک ایسی زبان میں ہے جو زندہ زبان ہے۔ وہ ذات گرامی ہم سے اس ضابطے کے حصول کا وسیلہ سمجھتے ہیں اس کی حیاتِ طیبہ اپنی انتہائی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ پھر خود بہ حیثیت قوم ہماری

اپنی چودہ سو سال کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ان آئینوں میں ہمیں اپنی بے راہ روی یا اپنے افکار و اعمال کا تضاد صاف نظر آجاتا ہے۔ یہ سرمایہ ہمارا اجتماعی حافظہ ہے۔ اسے بھلا دیں تو پھر ہم خود بھی باقی نہیں رہ سکتے۔

ہماری اپنی تاریخ کے یہ چودہ سو سال ہمارے لئے بھی بہت اہم ہیں اور انسانی تاریخ کے لئے بھی۔ ہمارا علمی اور فکری سرمایہ دنیا کی ساری قوموں سے زیادہ ہے۔ اور اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جو زندگی کے ہر دور میں مراحل ارتقا سے گزرنے کے لئے ہماری رہنمائی کر سکتا ہے وہ حیات آفریں ہے۔ زندگی بخشی ہے۔ اس میں زندگی کے ہر اس تقاضے کی تسکین کا سامان ہے جو ارتفع اور ارتقا کا ضامن ہے۔ ہمارا ضابطۂ حیات انسانی ذہن کی ہر سطح کی ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ عقائد کی سطح کی بھی اور خالص علمی سطح کی بھی۔ اس سے معاشرتی فلاح کی راہیں بھی کشادہ ہوتی ہیں اور تسخیر کائنات کی بھی۔ دنیا میں دوسری قوموں نے علمی، فنی اور تکنیکی شعبوں میں جو مسرت آمیز اور حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔ وہ ہمارے لئے چیلنج ضرور ہیں لیکن ہمارے ضابطۂ حیات کے دائرے سے باہر نہیں ہیں جس کے ذریعے انسان پہ پہلی مرتبہ اس عظیم حقیقت کا واضح انکشاف ہوا کہ زمین میں اور خلاؤں میں جو کچھ ہے وہ اس کی قوتِ تسخیر کے تابع ہے۔

ہمارے عقیدے کی بنیاد علم ہے۔ ہمارے عمل کی بنیاد احترام آدمیت ہے۔ ہماری معاشرت نسلِ انسانی کی وحدت کے تصور پر قائم ہے۔ قانون کی بالادستی ہمارے اجتماعی نظام کا محور ہے۔ ہماری نگاہ میں انسانوں کے درمیان عظمت کا معیار کردار کی بلندی ہے اور رنگ اور نسل اور قبیلے اور قومیت کا فرق محض انسانوں کے باہمی تعارف کے لئے ہے۔ ہم اپنے اس ضابطۂ حیات پر فخر بھی کرتے ہیں اسے برقرار رکھنے پر اصرار بھی کیونکہ یہ ہمارا جزو ایمان ہے کہ اس سے بہتر نظام انسان کو نہ میسر آیا ہے نہ آئے گا۔ قوانینِ قدرت کی طرح یہ نظام بھی جدلیاتی شکست و ریخت سے بلند تر ہے بلکہ جدلیات کی آزمائشوں سے گزار کر وہ قوت جسے تاریخی وجوب کہا جاتا ہے جو افکار و نظریات بھی بالآخر ہمارے سامنے پیش کرے گی وہ بھی اسی نظام کے مطابق ہوں گے۔ اپنے اسی ضابطۂ حیات کو دورِ حاضر کے تقاضوں کے

مطابق روبہ عمل لانے کے لئے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ اسی فکر پر ہم پاکستانی ثقافت کی تعمیر کے آرزومند ہیں۔

بات یہ نہیں ہے کہ مسلمان کو اپنے وطن سے محبت نہیں ہوتی یا ہم کسی خیالی دنیا میں رہتے ہیں یا بہ حیثیت مسلمان ہمارے ذہنوں میں مذہبی تعصب راسخ ہوجاتا ہے۔ درست ہے کہ ہمارے درمیان اسلام کا نام لینے والے ایسے بہت سے ہیں جن کا زاویۂ نگاہ نہایت محدود ہوتا ہے اور جو خود تعصبات کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد ایسی ذہنیت کی نمائندگی نہیں یہ اندازِ نظر تو خود بے شمار لوگوں کے لئے اسلامی فکر قبول کر لینے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے، بات دستورِ حیات کی ہے۔ ہمیں اپنے شہر سے بھی محبت ہے، علاقے سے بھی محبت ہے، وطن سے بھی محبت ہے، ہمیں اپنے برِاعظم ایشیا سے بھی محبت ہے، ہمیں اس ربع مسکوں سے بھی محبت ہے جس پر انسانیت آباد ہے۔ لیکن محبتوں کا یہ وسیع ہوتا ہوا دائرہ ہمارے اسی ضابطۂ زندگی کی بدولت ہے۔ اس سے رشتہ توڑ کر ہم اپنے تشخص سے، اپنی خود اعتمادی سے محروم ہوجائیں گے اور ہمیں اگر ہمارے نام سے نہ پہچانا جائے تو پھر تعارف کہاں اور پہچان کیسی۔ فرانس اور برطانیہ اور جرمنی اور ہالینڈ کی مثال ہم پر صادق نہیں آتی۔ انگریز شیکسپیئر پر فخر کرے گا، جرمنی گوئٹے پر اور فرانسیسی وکٹر ہیوگو پر ان میں سے فیض صاحب کے خیال کے مطابق ہومر پر کوئی ناز نہیں کرے گا۔ لیکن ہم پاکستان کے رہنے والے بابا فریدؒ، شاہ لطیف اور خوشحال خٹک پر بھی فخر کریں گے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ پر بھی اور حافظ و رومیؒ پر بھی کیوں کہ یہ سب ہماری ملکیت کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ اسلام جس وسیع النظری کی تعلیم دیتا ہے اسی کے پیشِ نظر اقبالؔ نے تو نظریاتی اختلاف کے باوجود کارل مارکس کی فکری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے "پیغمبر بے جبرئیل" کہا ہے۔ سیون شریف، لاہور، ملتان اور خیبر اس وقت ہماری جغرافیائی حدود میں ہیں لیکن یہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی ہمارے ہی تھے۔ رہ گئی موہن جوڈارو اور ٹیکسلا کی بات، تو ہم ٹیکسلا کی باقیات کا احترام کریں گے کیونکہ انسانوں کے ایک بڑے مصلح سے ان کی وابستگی ہے اور دنیا کے کروڑوں انسانوں کو ان سے جذباتی تعلق ہے۔ اور موہن جوڈارو پر

ہم فخر و مسرّت کا اظہار کریں گے کہ اس سے پانچ ہزار قبل کی تہذیب کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے جو پاکستان کے حصّے میں آتی ہے۔

فیضؔ صاحب نے ثقافتی مسائل سے متعلق تین اصول بیان فرماتے ہیں۔ پہلا یہ کہ "کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے اور پورے طریقۂ زندگی کو کلچر کہتے ہیں" دوسرا یہ کہ "کلچر اور ریاست کے حدود عام طور پر یکساں نہیں ہوتے" اور تیسرا یہ کہ "تہذیبی معاملات میں ہمیں کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہیئے"۔ ان اصولوں سے کسی کو اختلاف نہیں ہے، اب بات صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ پاکستان کی ثقافت کے سلسلے میں ان اصولوں کا اطلاق کس طرح کیا جائے۔ یہ اطلاق جس انداز کا بھی ہو اس کا نتیجہ ایسا ہونا چاہیئے کہ ان اصولوں کی روح برقرار رہے۔ اور اگر ایسا ہو سکا تو وہ نظریہ اور وہ فکر قائم رہے گی جس کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا۔ ان اصولوں کا مفہوم واضح ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔ ہمارا ملک ایک نظریۂ زندگی کی عملی تفسیر کے لئے قائم ہوا تھا لہٰذا پہلے اصول کے تحت وہی نظریہ ہمارا "طریقۂ زندگی" ہے اور کیونکہ پاکستان نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا ہے لہٰذا اس ملک سے بہتر انداز میں کوئی دوسرا ملک اس دوسرے اصول کی تشریح نہیں کر سکتا کہ "کلچر اور ریاست کی حدود عام طور سے یکساں نہیں ہوتیں" اسی وسیع النظری کی بنا پر ہم عملی طور سے اس تیسرے اصول کی صداقت کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ "تہذیبی معاملات میں ہمیں کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہیئے"۔

فیضؔ صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ "تہذیب محبّت کا نشان ہے اور امن و آشتی آغوش میں پھلتی پھولتی ہے"۔ لیکن تہذیب صرف محبّت کا ہی نشان نہیں ہوتی۔ یہ آزادی، خود اعتمادی اور جذبۂ عمل کا نشان بھی ہوتی ہے۔ ہمیں اس پہلو پر بھی ضرور غور کرنا ہے کہ حقیقت حال کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم پر اس وقت مغربی ثقافت اور تہذیب کا بڑا شدید غلبہ ہے۔ ہم نے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن ثقافتی اور ذہنی اعتبار سے ہم بہت تیزی کے ساتھ مغرب کی غلامی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس رجحان کے نتائج سیاسی غلامی کے اثرات سے کہیں زیادہ مہلک اور المناک ہوں گے۔ ایک طویل عرصے تک غلامی میں زندگی گزارنے کے بعد ہمیں آزادی ملی۔ پھر پاکستان میں

فکری شرائط کی بنیاد پر مسائل اور بھی بحث طلب ہوں گے۔ زبان کے مسائل اٹھے، ثقافت کے مسائل اٹھ رہے ہیں۔ ہم آزاد ہیں جب تک چاہیں ان مسائل پر گفتگو کرتے رہیں لیکن یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ کہیں ان باتوں سے بالواسطہ مغربی افکار و نظریات اور تہذیب و معاشرت کو ہمارے اُوپر اپنا غلبہ برقرار رکھنے میں آسانی تو پیدا نہیں ہو رہی ہے؟ اب تک تو نتیجہ ایسا ہی نکلا ہے کہ اپنی ان باتوں کو تو ہم موضوع بحث بنا دیتے ہیں اور اس طرح جو خلا پیدا ہوتا ہے اس میں مغربی خیالات اور طور طریقے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

وسیع النظری اور بین الاقوامیت کی آڑ لے کر ایک عرصے سے ہم اپنے فکر و عمل میں مغرب کی کاسہ لیسی اختیار کر کے اپنی سیاسی آزادی کی مسلسل نفی کرتے چلے جا رہے ہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ثقافتی اور تہذیبی انفرادیت کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ جنہیں اللہ نے علم و فن سے نوازا ہے اس سلسلے میں ان کی ذمہ داریاں دوسروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اجتماعی زندگی میں اعلیٰ قدروں اور خود اعتمادی کا احساس بیدار کرنا اہلِ علم کی ذمہ داری ہے سیاست دانوں کی ذمہ داری نہیں۔ ہمارے اہلِ علم اور اہلِ قلم کو بھی اپنی یہ ذمہ داری پوری طرح محسوس کرنی چاہیئے۔ تاریخ ان کا بھی احتساب کرے گی۔

اوراقِ فیض

اور

زہیر صدیقی

"تمام انسانیت ایک مربوط کتاب کی مانند ہے جس کا ایک ہی باب ہے اور ایک ہی مصنف۔ کوئی فرد ایک جزیرے کی طرح دوسرے سے الگ تھلگ نہیں، ہر شخص ایک براعظم کا ٹکڑا ہے، کل کا ایک جز ــــ کسی فرد کی موت کے ساتھ میرے اپنے وجود کا ایک حصہ فنا ہو جاتا ہے، کیونکہ میرا وجود بنی نوع انسان کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہٰذا جب کبھی گرجا کا جرس کسی موت کا اعلان کرے تو یہ نہ پوچھ کہ کون مرا ہے یہ خود تیرے ہی وجود کے ایک جز کا نوحہ ہے۔"

(جان ڈن)

آج سے قریب سال ڈیڑھ سال پہلے جب پاکستانی کلچر کے موضوع پر بحث چھڑی اور سارے ملک میں پھیلی، تو یوں محسوس ہوا کہ ہم سب کے دل میں کہیں نہ کہیں چور ہے۔ کیا ٹی وی کی محفلوں کے شرکاء، کیا سوال کرنے والے، اور کیا اخباروں رسالوں میں اس بحث کو آگے بڑھانے والے، قریب قریب سب کسی نہ کسی موقع پر اپنے اپنے تعصبات اور توہمات میں الجھے ہوتے نظر آتے۔ نسلی، لسانی اور مذہبی تعصب سے پوری طرح بری ہونا محال نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے، لیکن ان سے آزاد ہونے کی مسلسل کوشش لازم بھی ہے اور ممکن بھی۔ اور اسی جہد و کاوش میں انسان کی ذہنی اور اخلاقی ترقی مضمر ہے۔ مگر یہ کوشش ممکن اسی صورت میں ہے جب ہم میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے اور اسے برداشت کرنے کا دم بھی ہو۔ اور یہ اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے تو کوئی دانا کہہ گیا ہے کہ "سب سے بڑا انسان وہ ہے جو نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پرانے تعصّبات ترک کرتا ہے۔"

ٹی وی پر اس بحث کے آغاز پر بہت سے لوگوں کا پہلا ردِ عمل نہایت معنی خیز تھا۔

"یہ بحث آخر چھیڑی ہی کیوں گئی ؟ یہ کون سا وقت ہے ان بحثوں کا ؟ کیا ملک کو بیشمار سنگین مسائل کا سامنا نہیں ؟ ملک کے دو ٹکڑے ہو چکے اور جو رہ گیا ہے اسے کچھ شر پسند عناصر ان بے محل بحثوں میں الجھا کر تباہ کرنا چاہتے ہیں۔" وقس علی ہذا۔ اس ردِ عمل پر کسی تفصیلی تنقید کی ضرورت نہیں۔ اس کی طرف اشارہ صرف اس لئے کیا گیا ہے اس میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا خوف صاف جھلکتا ہے، اور جو لوگ اس ڈر کو چھپا لیتے ہیں ان کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جو اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔

دنیا کی کسی قوم کے کلچر کے متعلق یہ دعویٰ کہ اس کا آغاز کسی ایک تاریخی واقعے یا انقلاب سے ہوا، صریحاً خلافِ حقیقت اور بے معنی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ایک مکتبِ فکر کے حضرات بڑی شد و مد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس برصغیر میں اسلام کے ورود سے پہلے جو کچھ تھا وہ ہماری تہذیب کا حصہ نہیں اور اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ مردود و مردود ہے۔ وادیٔ سندھ کا نام آتے ہی یہ لوگ جز بز ہو جاتے ہیں، اور موہن جوڈاڑو اور ہڑپا تو گویا ان کی چڑ ہے۔ حالانکہ آج سے بیس برس پہلے، جب حاکمانِ وقت نے "ون یونٹ" کا ڈول ڈالا تو اسی وادیٔ سندھ کی تہذیب کو ایک مذموم سیاسی مقصد کے لئے خوب خوب استعمال کیا گیا۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اگر کلچر کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی، اس کے رہن سہن، اس کے جذبات و احساسات کی آرزوؤں اور امنگوں، اس کی اخلاقی قدروں، اس کے ذہن کی کاوشوں اور تخلیقوں سے ہے، تو کسی قوم کی تہذیب کا کوئی تاریخی نقطۂ آغاز متعین کرنا ممکن نہیں۔ تبدیلی فطرت کا قانون ہے اور قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے انقلاب بھی آتے ہیں جو پرانے نظام کے ڈھانچے کو تہ و بالا کر کے زندگی کے تمام شعبوں کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ لیکن کوئی انقلاب کسی خطِ فاصل کے ذریعے قوم کے پرانے کلچر کو اس کی زندگی سے یکسر خارج نہیں کر سکتا۔ پچھلے تیرہ سو سال میں دنیائے عرب کے مسلمانوں نے کبھی قبلِ اسلام کی

عظیم شاعری کو اپنے تہذیبی ورثے سے خارج کرنے کا ارادہ نہیں کیا، اور خود ہمارے تعلیمی نظام میں جاہلیت کی شاعری عربی کے اعلیٰ نصاب میں ہمیشہ شامل رہی۔ فردوسی مسلمان تھا، لیکن اس کے شاعرانہ وجدان کو تخلیق کا سرچشمہ قدیم ایران میں ملا اور وہ اپنے کمالِ فن سے اس کے ہیروؤں کو زندہ جاوید کر گیا۔ اور صرف ایران میں نہیں بلکہ ساری فارسی دان دنیا میں آج تک فردوسی کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تہذیب کے عروج کے زمانے میں قدیم یونانی علوم کے احیا۔ اور ان کی تشریح و تفسیر کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ جو بالآخر مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کا موجب ہوا۔ یورپ باوجود عیسائی ہونے کے آج تک قبلِ مسیح کے یونان و روم کے کارناموں پر فخر کرتا ہے، اور ان مسلمان امامانِ علم و دانش کی خدمات کا بھی معترف ہے جنہوں نے قدیم یونان کے انمول ورثے کو قرونِ وسطیٰ کی تاریکی سے نکالا۔ موجودہ زمانے میں اکثر مسلمان قوموں، مثلاً ترکی، مصر، اور ایران نے جدید تہذیب اختیار کرنے کے باوجود اپنی سرزمین کے قدیم تاریخی ورثے سے اپنا ناتا نہیں توڑا بلکہ نئے جوش سے اسے اپنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس رجحان کو فروغ دینے والوں نے شروع میں شدت، غلو اور تعصب سے کام لیا، لیکن رفتہ رفتہ ہر جگہ اس میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا گیا۔

عہدِ جدید کی مغربی دنیا میں دو بہت بڑے انقلاب آئے جنہوں نے سیاست، معاشرت، اقتصادیات، طرزِ فکر اور اخلاقی قدروں میں بنیادی اور دور رس تبدیلیوں کا آغاز کیا۔ لیکن فرانس میں ۱۷۸۹ء سے پہلے کے علمی، ادبی اور فنی شاہ کار اب بھی لوگ سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اور روس میں کسی نے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ۱۹۱۷ء سے پہلے کا تمام ادب اور علم و فن ڈان اور والگا کی موجوں میں بہا دیا جائے۔ اس کے برعکس سوویت یونین میں تو وسطِ ایشیا کے قرونِ وسطیٰ کے مسلمان امامانِ علم و فن کی یادیں بھی زور شور سے تازہ کی جا رہی ہیں۔ امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن پر سوویت یونین کے اہلِ علم و فن کا جوش و خروش ابھی کل کی بات ہے۔

اس سرزمین پر جسے آج ہم پاکستان کے نام سے جانتے ہیں، اَن گنت صدیوں

میں تمدن اور تہذیب نے جتنے بھی روپ اختیار کئے وہ سب مل کر ہمارا تہذیبی ورثہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ورثے کے تمام عناصر و مظاہر سے ہم سب کی جذباتی وابستگی یکساں نہیں ہو سکتی اور ان میں سے بہت سے عناصر کی کوئی جھلک ہماری آج کی تہذیب میں دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اس پسِ منظر کو نگاہ میں رکھے بغیر ہمارے کلچر کی جڑوں اور بنیادوں اور موجودہ دور تک اس کے ارتقا کا مطالعہ ممکن نہیں۔ پھر جس طرح اپنی سرزمین سے محبت ایک فطری جذبہ ہے اسی طرح اس سے وابستہ ہر چیز سے لگاؤ بھی ایک حد تک فطری ہے۔ تو ہماری سرزمین پر آج سے ہزاروں برس پہلے کے تمدن اور تہذیب کے جو آثار و مظاہر دریافت ہوئے ہیں، انہیں کیوں اور کیونکر ہم اپنے تہذیبی ورثے اور اپنے اجتماعی شعور سے خارج کر دیں۔؟

یہ صحیح ہے کہ ہمارے تہذیبی ورثے کا ہر عنصر، چاہے اس کا نقطۂ آغاز قرونِ وسطیٰ میں ہو یا عہدِ قدیم میں، آج ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ لیکن کسی عنصر کے قبول یا رد کرنے کا فیصلہ اس بنا پر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس زمانے میں ظہور میں آیا۔ ہماری آج کی زندگی کے معاشرتی اور معاشی مطالبے، ہماری نشوونما اور ترقی کے موجودہ تقاضے، اور ہماری آج کی قدریں ہی اس فیصلے کا معیار ہو سکتی ہیں۔

یہ بھی صحیح ہے کہ سرزمین سے محبت اور اس کی قدیم تہذیب سے وابستگی میں شدت اور غلو خوبی نہیں، عیب ہے، اور یہ بعض وقت ایک ذہنی اور جذباتی آسیب یا OBSESSION کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بالآخر قوم کے لئے نہایت مضر ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جذبہ بجائے خود فطری اور صالح ہے، اس کے رجعتی اور مضرت رساں پہلو کا ذکر بعد میں آئے گا۔

دوسرا مسئلہ جس پر بحث اکثر بڑا جذباتی رنگ اختیار کر لیتی ہے، وہ ہمارے کلچر کی حدود یا سرحدوں کا سوال ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہمارے چند ادیبوں اور کالم نویسوں نے پاکستان کی تہذیب کے گرد "دیوارِ چین" کی تعمیر کا نعرہ بلند کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس برصغیر کے بقیہ حصے سے اپنے ناتے توڑ کر عربستان اور ترکی و

ایران سے جوڑ لیں اور اپنے وطن کو برصغیر سے نکال کر مشرقِ وسطیٰ کا حصّہ بنا دیں۔ گویا کلچر بھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی طرح ایک میکانکی چیز ہے کہ جب چاہا ایک ویو لینگتھ (WAVELENGTH) یا چینل (CHANNEL) بدل کر دوسرا اختیار کر لیا۔ اس صدی کے اوائل میں لینن نے ایک نظریاتی بحث کے سلسلے میں اپنے ایک مخالف پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس نے ایک چسُت فقرے کی خاطر ایک عظیم حقیقت کا خون کر دیا۔" لیکن ہمارے دیوارِ چین والے "دانشور" تو اپنی بے سر و پا تجویز کے حق میں کوئی خوبصورت یا پُرزور فقرہ بھی نہ لکھ سکے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ جب کچھ عرصے بعد ٹی وی پہ بحث کے دوران میں بعض شرکا نے ہمارے کلچر کے جغرافیائی حدود پر زور دیا تو "نظریۂ پاکستان" کے علم برداروں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ "لوگو دیکھو، یہ تو سرکاری ذرائع ابلاغ کے توسل سے ہماری تہذیب کا تیا پانچا کیا جا رہا ہے۔ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر غاصب و جابر تھا۔ حضرت امیر خسرو، غریب نواز اور گیسو دراز وغیرہم سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں، میر، غالب، حالی، سرسید وغیرہ تھے۔" وعلیٰ ہذا القیاس ؎

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
ہیں کہاں ہار ماننے والا

"دیوارِ چین" والوں کے نعرے اتنے کھوکھلے اور ان کی منطق اتنی بودی ہے، کہ اس پر مزید بحث غیر ضروری ہے، لیکن ہمارے کلچر کی وسعت، اس کی حدود، اور قرب و جوار کی دوسری تہذیبوں سے اس کے تعلق اور روابط کا مسئلہ یقیناً سنجیدہ غور و فکر اور بحث کا مستحق ہے۔

پاکستان کے سوا دنیا کا کوئی ملک شاید اس نوعیت کے مسئلے سے دوچار نہیں۔ ہمارا ملک اٹھائیس برس پہلے ایک برِّ عظیم کی تقسیم سے وجود میں آیا جس کا وہ صدیوں سے ایک حصّہ رہا تھا۔ اس طویل عرصے میں ہندوستان کے مختلف حصّوں اور علاقوں اور خصوصاً شمالی ہند کے لوگوں میں بہت سے مشترک تہذیبی عناصر کا ارتقا عمل میں آیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ، گیارھویں میں پنجاب اور تیرھویں صدی میں وادیٔ گنگ و جمن میں مسلمانوں کے ورود سے ملک کی زندگی میں ایک نیا عنصر داخل ہوا اور اس کے بعد کی صدیوں میں اسلامی اور ہندو

تہذیبوں کی مسلسل آویزش کے ساتھ ساتھ افہام و تفہیم اور اشتراک کے کچھ نئے تقاضے بھی پیدا ہوتے۔ دونوں تہذیبوں میں سے کوئی بھی دوسری کو مٹا نہ سکی۔ نہ ایران کی طرح اسلام ساری مفتوح قوم پر حاوی ہو سکا، نہ اسپین کی طرح مفتوح قوم بالآخر اسے فنا کر سکی۔ ایک "قربِ فراق آمیز" کی سی کیفیت رہی۔ جس میں آویزش، مناقشات اور جدال و قتال کے ساتھ ساتھ لین دین اور اتفاق و تعاون کی کچھ راہیں بھی کھلیں۔ قربِ مکانی اور ساتھ ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے سے زبانوں کا اشتراک، کم از کم بول چال کی زبان میں، لازماً پیدا ہوا۔ طرزِ معاشرت رسم و رواج اور تہواروں میلوں میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے بہت سے طور طریقے اپنا لئے۔ بابل، بنرے اور شادی بیاہ کے دوسرے گیت گانے مشترک ہوتے۔ صدیوں کے بُعد اور سیاسی نفرتوں اور علیحدگی کے باوجود آج تک کلچر کے یہ عناصر و مظاہر بہت کچھ مشترک ہیں۔

صوفیائے کرام نے عوام کی بولیوں میں ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کیا اور انسانی اخوت کے پیغام اور باہمی رواداری کی تلقین سے مفاہمت اور اتفاق کی نئی راہیں اجاگر کیں۔ مسلمان سلطانوں اور شہنشاہوں کے دور میں ملک کا بیشتر حصّہ سیاسی اور انتظامی امور میں متحد ہوا۔ چار سو سال کے اس عمل میں ہندو مسلمان کبھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوتے اور کبھی ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ اپنے اپنے ہم مذہبوں کے خلاف صف آرا ہوتے۔ ان صدیوں میں فنِ تعمیر، مصوّری اور موسیقی میں جو ترقی ہندوستان میں ہوئی اس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے اور ان کے اس اشتراک نے اِن فنون کے ارتقاء پر لازوال نقش چھوڑے۔

کمپنی کے سو سالہ دورِ حکومت میں اگر ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی نزاع اور ان کی سیاسی رقابتوں نے رنگ دکھایا تو دوسری طرف غیر ملکی غاصبوں کے خلاف ان کے اتفاق و اتحاد کے روح پرور مناظر بھی دیکھنے میں آتے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے نہ صرف قریب قریب سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بلکہ بے شمار موقعوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی پرچم کے تلے اور ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ دونوں نے مل کر جگہ جگہ اس سرزمین

کو اپنے خون سے سینچا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آخر کار ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات غالب آئے اور تقسیم ہند کا باعث ہوئے۔ لیکن اجتماعی زندگی، تہذیب و زبان اور علم و فن میں جو اشتراک صدیوں کے تاریخی عمل سے پیدا ہوا تھا، وہ یکایک کالعدم تو نہیں ہو گیا۔ اس اشتراک کے تین نمایاں پہلو تھے۔ ایک وہ جو سارے ملک پر محیط تھا اور اس کی تہذیب کو دوسرے ملکوں کے کلچر سے ممیز و ممتاز کرتا تھا۔ دوسرا وہ جس نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو آپس میں مربوط اور غیر مسلموں سے ممتاز کر رکھا تھا۔ اور تیسرا وہ جو برصغیر کے مختلف علاقوں کے اندر ان میں بسنے والے مختلف فرقوں میں پایا جاتا تھا اور جس کا سب سے اہم عنصر لسانی اشتراک تھا۔ برصغیر کی سیاسی تقسیم سے ان دو نئے ملکوں کے تہذیبی ارتقا کی راہوں میں ایک حد تک تفاوت پیدا ہونا تو ناگزیر تھا، لیکن یہ دعویٰ کہ اس کے باعث دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے لئے غیر ہو گئیں اور میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ سے ہمارا رشتہ اسی قدر رہ گیا جتنا فردوسیؔ اور حافظؔ اور سعدیؔ سے ہے حقیقت کا منہ چڑانا اور انصاف کا خون کرنا ہے۔ تہذیب کا دھارا سیاسی حد بندیوں کا پابند نہیں اور اگر اس طرح اس کے بہاؤ کا روکنا ممکن بھی ہو تو اس میں نقصان سراسر روکنے والوں کا ہی ہوگا۔ سعدیؔ اور حافظؔ کی زبان جاننے والے اس ملک میں کتنے ہیں، اور کیا مسلمانوں کی حکومت کے عروج کے زمانے میں بھی وہ ملکی زبان کے درجے کی مستحق ہوتی۔ یہ اس کے برعکس میرؔ اور غالبؔ کی زبان، اور اس زبان سے جو تہذیب وابستہ تھی، اس میں موجودہ پاکستان کا بیشتر حصہ صدیوں شمالی ہندوستان کا شریک رہا۔ اور پھر کلچر کی اس حد بندی میں بے چارے حالیؔ کدھر جائیں گے؟ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ حالیؔ سر تا سر اسلامی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہونے کے باوجود گھوپتی سہائے فراقؔ کے لئے تو "ہمارے" ہیں لیکن ہمارے لئے غیر ہو گئے۔ اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر پنجاب کی تقسیم نہ ہوتی ہوتی اور ہمارے ملک کی سرحدیں وہی قرار پاتیں جن کا مطالبہ برصغیر کے مسلمانوں نے کیا تھا یا اگر لارڈ ریڈکلف نئے ہند کے بجائے پاکستان پر مہربان ہو جاتے تو کیا ہمارے کلچر کی آغوش حالیؔ کے لئے کھل جاتی؟ یا اگر اس کے برعکس ریڈکلف صاحب ہندوستان پر مزید مہربان ہو جاتے اور سیالکوٹ بھی اس کے حوالے کر جاتے تو کیا اقبالؔ ہمارے لئے غیر

ہو جاتے ؟

اور پھر برّصغیر کی تقسیم سے صرف اردو زبان ہی تو تقسیم نہیں ہوتی، دو بڑی علاقائی زبانیں، یعنی پنجابی اور بنگالی، بھی تو بٹ گئیں۔ تو کیا بنگال کی تقسیم کے ساتھ ٹیگور مشرقی پاکستان کے لوگوں یا وہاں کی مسلمان اکثریت کے لئے غیر ہو گیا۔؟ قیامِ پاکستان کے بعد ۲۳ برس تک مغربی پاکستان کے "محبانِ وطن" اس بات پر مصر رہے کہ بنگال کے مسلمان ٹیگور کو اپنے تہذیبی ورثے سے خارج کر دیں۔ ٹیگور سے ان کا ناتا تو نہ ٹوٹ سکا، لیکن بنگال بالآخر پاکستان سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔

خیر چلیئے، مشرقی پاکستان تو الگ ہو گیا اور ٹیگور کا مسئلہ ہمارے لئے ختم ہوا۔ لیکن کیا تقسیم سے پہلے کا وہ پنجابی ادب جو ہندوؤں یا سکھوں کی تخلیق تھا، پاکستانی پنجاب کے لئے غیر ہو گیا؟ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ہندوستان، جس کی غالب اکثریت کو ہم صبح شام تنگ نظری، تعصب، اسلام دشمنی اور اردو دشمنی کا طعنہ دیتے رہتے ہیں، غالب اور میر سے بڑھ کر اقبال تک کو اپنے تہذیبی ورثے کا ایک اہم جز قرار دے، اور ہم برّصغیر کی تہذیب کے ہر اس عنصر سے اپنا ناتا توڑنے پر مصر ہوں جو موجودہ پاکستان کی سیاسی سرحدوں میں شامل نہیں۔ ہندوستان تو اقبال کو قبول کرنے سے بھی نہیں ڈرتا، جس کے فکر و سخن نے مسلمانوں میں علیحدگی کے اس رجحان کو تقویّت بخشی جو بالآخر تقسیمِ ہند کا باعث ہوا۔ اور ادھر ہم ہیں کہ خود اپنے سائے سے بھی ڈرے ہوئے ہیں اور اپنے کلچر کو سرحدوں اور ملکیّت کے بکھیڑوں میں الجھا کر اس کی جڑوں کو کمزور اور اس کے پھیلاؤ کو مقیّد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میرؔ، غالبؔ، اور حالیؔ اردو کے شاعر تھے، اور اردو کو موجودہ پاکستان کے کسی علاقے میں مادری زبان کی حیثیت حاصل نہیں۔ لیکن پاکستان کے بیشتر حصّوں میں اردو کبھی بالکل غیر زبان بھی نہیں رہی۔ شہری علاقوں میں ہمیشہ رائج رہی، مختلف لسانی گروہوں کے درمیان ذریعہ اظہار رہی، اور پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں کسی نہ کسی شکل میں اسے دوسری مادری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ بقول مولوی عبدالحق "اردو نے پنجاب میں جنم تو نہیں لیا لیکن اس کا بیج پنجاب ہی میں پڑا"۔ پھر پچھلی ایک ڈیڑھ صدی میں پنجاب نے اردو ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی

ہیں اس کے پیشِ نظر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ پنجاب کے لئے اردو غیر زبان ہے؟ یہ خدمت کسی جبر کے تحت یا دِلّی آگرے کے اثر سے مرعوب ہو کر نہیں کی گئی، بلکہ رضا و رغبت اور جوش و خروش سے۔

اس سے انکار نہیں کہ تقسیمِ ملک سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک، بعض "اہلِ زبان" حضرات نے اپنی تنگ نظری اور تعصّب، اور علم اللسان سے ناواقفیت کی بنا پر اہلِ پنجاب کی اردو پر بہت کچھ بے جا طعنہ زنی کی۔ یہ بات ضرور دل آزادی کا باعث ہوئی اور یقیناً قابلِ ملامت ہے، لیکن اس کا ردِّ عمل کہاں تک صحیح ہے کہ پنجاب خود اس وقیع و حسین سرمائے سے دست بردار ہو جائے جو اس نے اردو ادب کو عطا کیا ہے؟ ایران کے اہلِ زبان نے ہندوستان کی فارسی شاعری کو کبھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھا، لیکن ہندوستانی کلچر پر فارسی کی بالادستی کے اٹھ جانے کے بعد بھی غالبؔ و اقبالؔ نے اردو سے زیادہ فارسی کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ اور باوجود اس کے کہ فارسی مسلمانوں کی شہنشاہیت کی یادگار تھی، اس صدی کے اوائل تک تعلیم یافتہ ہندو گھرانوں میں لوگ فارسی بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور اپنی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے۔

اِس سلسلے میں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ اردو کے اہلِ زبان کے قدامت پرست طبقے نے تو اُن ادیبوں شاعروں تک کو نہیں بخشا جو خود اہلِ زبان تھے جس کسی نے بھی انشاء یا اسلوب یا طرزِ ادا میں کوئی نیا رُخ دکھائی اور زبان کے پرانے سانچوں سے ذرا بھی انحراف کیا وہ "مُخرّبِ زبان" قرار پایا۔ دلّی اور لکھنؤ کی لسانی چشمکوں میں دونوں فریق اہلِ زبان ہی تھے۔ حالیؔ کے گھر کی زبان اردو تھی مگر اُن سے زیادہ اہلِ زبان کے، خصوصاً لکھنؤ کے نک چڑھوں کے، طعنے کس نے سُنے؟ ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

امروہا ٹھیٹ اردو کے علاقے میں واقع ہے، لیکن محمد حسین آزادؔ، مصحفیؔ کو "امروہے پن" کا طعنہ دیتے ہیں۔ جوشؔ صاحب مولانا نذیر احمد تک کو نہیں بخشتے۔ حالیؔ کے ہموطن وحید الدین سلیمؔ

کو جو اپنے وقت کے بہت بڑے زبان دان تھے، ساری عمر یہ شکایت رہی کہ اردو بولنے والی قوم لکیر کی فقیر ہے اور کوئی نیا لفظ لکھنا یا بولنا اس کے نزدیک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہ ہوگا۔

تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ہاں ہر مسئلہ ہندو مسلم تنازعے کے رنگ میں دیکھا جاتا تھا۔ کوئی امتحان میں فیل ہوا، کسی کو نوکری نہ مل سکی، کسی کا کاروبار نہ چل سکا، کسی کی وکالت یا ڈاکٹری نہ جم سکی، ہر صورت میں محرومی کی وجہ فرقہ وارانہ تعصّب ہی میں تلاش کی جاتی تھی۔ آج ہمارے ملک میں یہی ذہنیت بین الصوبائی منافرت کے رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے اور اس لعنت سے کوئی صوبہ اور کوئی لسانی گروہ بری نہیں۔ اہلِ زبان اور دوسرے اردو دانوں کے مابین جو بحثیں ہوتی ہیں اُن کی تہہ میں بھی اکثر یہی ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ زبانوں کی صحت اور فصاحت کے معیاروں کے متعلق علمی بحثیں چلتی ہی رہتی ہیں اور اگر نیّت بخیر ہو اور بحث کا لہجہ علمی، متین اور سنجیدہ ہو تو یہ زبان کی ترقی اور اصلاح میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں تعصب اور کسی گروہ کی تحقیر کا جذبہ ہو یا سنجیدہ تنقید کو بھی کوئی گروہ اپنے آپ پر حملہ سمجھ لے اور دفاع میں سینہ سپر ہو جائے تو انجام معلوم۔

آج سے قریب نصف صدی پہلے اِس موضوع پر اقبال نے جو لکھا تھا، اور قیامِ پاکستان کے بعد مولوی عبدالحق نے ایک سے زیادہ مرتبہ جو اصول بیان کیا، وہ آج بھی ہمارے لیے اس مسئلے میں شمعِ ہدایت ہے، اور اگر ہماری آج کی بحثوں میں یہی اصول پیشِ نظر رکھے جائیں تو بہت سے کانٹے نکل جائیں گے اور بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

اقبال لکھتے ہیں: "ابھی کل کی بات ہے اردو زبان جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادّہ تھا اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصّوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب کبھی تمام ملک ہندوستان اُس کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں اِس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریقۂ معاشرت، اُن کے تمدنی حالات اور اُن کا طرزِ بیان ان پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ مسلّمہ اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات

کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں کہ اِس اصول کے عمل کو روک سکے۔"

مولوی عبدالحق کہتے ہیں، "زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ اُس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے۔ جو اُسے بولتا ہے اُسی کی زبان ہے جو زیادہ صحت اور فصاحت کے ساتھ بولتا ہے وہی زیادہ تر زبان دان اور اہلِ زبان کہلانے کا مستحق ہے۔ اِس میں نہ کسی صوبے کی تخصیص ہے اور نہ کسی قوم اور نسل کی۔"

زبان کی صحت و فصاحت اور روزمرہ اور محاوروں کی بحثوں سے قطع نظر، پاکستان میں اُردو کے مسئلے نے جو صورت اب اختیار کرلی ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد اردو بولنے والے لوگ لاکھوں کی تعداد میں ترک وطن کرکے پاکستان میں آبسے۔ وہ کیوں آئے اور کس نے انھیں آنے دیا اور اُن کی ہمت افزائی کی۔ اِس کا جواب جن حضرات سے طلب کیا جاسکتا تھا۔ ان میں سے بیشتر اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ یوں بھی یہ سوال سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری موجودہ بحث کے دائرے سے خارج۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے کئی برس تک ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقے، جن میں سے بیشتر بعد میں پاکستان میں شامل ہوئے، دو قومی نظریئے کی بنا پر تقسیم ہند کا مطالبہ کرتے رہے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمان بھی اِس مطالبے میں شریک تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر "پاکستانی صوبوں" کے مسلمان کثرتِ رائے سے، اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے یا براہِ راست، تقسیم ہند کے مطالبے کی تائید نہ کرتے تو پاکستان وجود میں نہیں آسکتا تھا، خواہ اقلیتی صوبوں کا ایک ایک ووٹ اس کے حق میں ہوتا۔ اُن علاقوں کے مسلمان رہنماؤں کو اچھی طرح معلوم تھا، یا معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ جس نظریئے کے نام پر تقسیم ہند کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور اس کے نتیجے میں جو صورت حال برصغیر میں پیدا ہوگئی ہے، اُس میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اقلیتی صوبوں کو چھوڑ کر اکثریتی صوبوں کا رُخ کرے گی۔ اِس ریلے کو روکنے یا محدود کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ پاکستانی علاقوں سے غیر مسلم اقلیتوں کا انخلا روکا جاتا اور مرکزی حکومت کی ملازمتوں کی تقسیم عمل میں نہ آتی لیکن ہوا یہ کہ مسلم لیگ کی قیادت نے، جس میں پاکستانی علاقے کے زعما پوری طرح شامل تھے، مرکزی حکومت کے مسلمان افسروں اور عملے کو پاکستان میں خدمت اختیار کرنے کا حق دلوایا اور پھر ہندوستانی

علاقوں کے اُن تمام ملازمین کو قبول کر لیا جنھوں نے پاکستانی حکومت کی خدمت میں شریک ہونا چاہا اس کے علاوہ اِس نئے ملک کے ایک بڑے حصّے سے غیر مسلم اقلیتیں لاکھوں کی تعداد میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان چلی گئیں اور مقامی قیادت اِس زبردست انخلا کو روکنے میں ناکام رہی یا اُس نے اُسے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ انھوں نے اس پر اعتراض کیا کہ پاکستان بنتے ہی مملکت اور حکومت دونوں کی سربراہی اقلیتی صوبوں سے تعلق رکھنے والے دو اکابر کو سونپ دی گئی۔ آج پاکستان میں جو اردو بولنے والوں کی اتنی بڑی تعداد نظر آ رہی ہے وہ انہی عوامل کی کارفرمائی کا مجموعی اور ناگزیر نتیجہ ہے اور اس کے ذمہ دار وہ سب لوگ ہیں جو متعلقہ فیصلوں اور کارروائیوں میں شریک رہے یا جنھوں نے اپنے اپنے صوبوں کے نمائندوں کی حیثیت سے انھیں قبول کیا۔

بہر حال وجوہ و عوامل کچھ بھی ہوں، جو لوگ یہاں آ کر رس بس گئے وہ اب یہیں کے ہو گئے اور ان کی زبان اور ان کی تہذیب، جو پہلے بھی ان علاقوں کے لیے غیر نہ تھی۔ اب پاکستان کے قومی کلچر کا جزو بن چکی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے تھوڑے بہت اب تک احساسِ برتری کا شکار ہیں اور انھوں نے نئے حالات کے تقاضوں کو ابھی تک پوری طرح قبول نہیں کیا، لیکن زمانہ ان کے بل خود نکال دے گا، اور جتنی دیر وہ اپنے کو بدلنے میں لگائیں گے اتنا ہی خود اپنا نقصان کریں گے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی عنصر کے شمول سے ہمارے تہذیبی اور لسانی مُرقّع میں کچھ نئے رنگ پیدا ہوئے ہیں اور کچھ پرانے نقش زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔ ان کو نکالنے یا مٹانے کی بات کرنا تنگ نظری اور تعصّب کی دلیل ہے اور یہ کارروائی عملاً ممکن بھی نہیں۔ جس طرح دنیا کی ہر زبان کم و بیش مخلوط ہے اسی طرح کسی قوم کا کلچر "خالص" نہیں۔ ہر ترقی یافتہ کلچر میں دوسری تہذیبوں کی آمیزش ہے، کسی میں کم، کسی میں زیادہ ـــ اور یہ کلچر کا عیب نہیں، اُس کا حُسن ہے۔ اِس اختلاط اور آمیزش سے کلچر میں تنوّع پیدا ہوتا ہے، اُس کی وسعت بڑھتی ہے اُس کا حُسن نکھرتا ہے۔ ترقی کی نئی راہیں کھُلتی ہیں اور انسانی ذہن کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے اظہار کے لیے نئے نئے امکانات ملتے ہیں۔

اپنے ملک کے موجودہ حالات سے قطع نظر، ذرا برصغیر کی تاریخ کے چند باب پلٹ جائیے اسلام جب قرونِ وسطیٰ میں سرزمینِ ہند پر وارد ہوا تو ایک نظام بیرونی اور اجنبی عنصر تھا بقول مولوی

عبدالحق نو وارد مسلمانوں کے لیے یہاں کی " ہر چیز اجنبی اور ہر بات اُن کی طبیعت کے مخالف تھی آب و ہوا، رسم و رواج، صورت و شکل، آداب و اطوار، لباس، بات چیت، غرض ہر چیز ایسی تھی اُن کو اہلِ ملک سے اور اہلِ ملک کو اُن سے وحشت ہو۔ پھر مسلمان فوجوں کے حملوں، اہلِ ملک سے ان کے جدال و قتال اور بالآخر مسلم اقتدار کے تسلط سے لازماً باہمی عناد اور نفرت پیدا ہوئی جس سے صدیوں ملک کی سیاست، معاشرت اور تہذیب آلودہ رہی تاہم دونوں قوموں کے درمیان افہام و تفہیم، لین دین اور تعاون، اور ان کی تہذیبوں کے امتزاج کا عمل بھی جاری رہا اور آج بھی ہندوستان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر مسلمانوں کے کلچر کی چھاپ یا اس کا اثر نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ بقول مولانا آزاد " اس ملک کی تاریخ میں جو اجلے نقش و نگار تمہیں نظر آتے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ یہاں لایا تھا۔" مہاسبھائی اور جن سنگھی مجنونوں کو چھوڑ کر خود ہندو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس اثر نے ملک کے کلچر کو زیادہ گہرا، جاندار، پہلودار اور حسین بنایا ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے ہندوستان کے ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند مرحوم نے ایک پوری کتاب اس موضوع پر تصنیف کی تھی۔ اور تقسیم ہند کے بعد بھی انہیں ہندوستان کی تہذیب پر اسلامی اثرات پر فخر رہا۔ برصغیر کی جنگِ آزادی کی تاریخ، جو آزادی کے بعد انہوں نے لکھی اور حکومتِ ہند نے شائع کی، اس مقدمے میں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمان فاتح اپنے مذہب پر قائم اور اپنی تہذیب سے بہت کچھ وابستہ رہے۔ لیکن انہوں نے غیر ہندی سرزمینوں سے اپنے ناتے توڑ لیتے، اسی لیے ملک کے ہو رہے۔ اور اسی کے باشندوں کی تقدیر سے اپنی تقدیر وابستہ کر لی۔ انہوں نے اپنی بہت سی رسوم اور طور طریقے ترک کر کے ہندوستانی زندگی اور تہذیب کے بہت سے اثرات کو قبول کیا۔ ہندوستان کے مذہبی نگار خانے میں ایک نئے دین کا اضافہ ہوا اور نئے عناصر کے نفوذ سے اس کی رنگا رنگ تہذیب میں مزید تنوع پیدا ہوا۔"

یہ رویہ اور نقطہ نظر ہے ایک مہذب وسیع النظر دانشور کا، جو کلچر کے ارتقاء کے

اصولوں کا ادراک رکھتا ہے، اپنی قومی تہذیب کے تنوّع اور اس کی رنگارنگی کا دلدادہ ہے اور اس کے مختلف عناصر کو خواہ ان کا منبع ملک کی سرزمین کے اندر ہو یا باہر اپنا سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے کلچر کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ تنگ کیا جائے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام سے قبل کی تہذیب کو بھول جاؤ، کوئی عربی فارسی کے "تسلّط" کے خلاف سرگرمِ عمل ہے، کوئی دہلی آگرے کی "مرعوبیت" کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کے ذہن پر "مغل کلچر" کا آسیب سوار ہے، کوئی ہندوؤں اور سکھوں کے کلچر کے بچے کھچے اثرات مٹانے کے درپے ہے، کچھ لوگ تمام فنونِ لطیفہ کو ہماری زندگی سے خارج کر کے دفن کر دینا چاہتے ہیں۔ پھر بے چاری تہذیب میں رہے گا کیا؟

کلچر پر بحث میں شہنشاہی تہذیب اور درباری تہذیب کا ذکر بھی بار بار آیا ہے۔ ایک صاحب نے ذرا اور آگے بڑھ کر "مغل کلچر" پر (جو مدتیں ہوئیں مرحوم ہو چکا) دھاوا بول دیا اور اکبر اعظم اور راجپوت شہزادیوں کے ازدواج پر بھی طعنہ زنی کی۔

سوال یہ ہے کہ مغل کلچر آج کل ہمارے ملک، یا پورے برصغیر کے کسی حصّے میں پایا جاتا ہے۔ یہ مغل کلچر جس چیز کا نام ہو سکتا ہے وہ تو اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی میں دم توڑ چکا تھا اور انیسویں صدی میں انگریزوں نے اس کے ڈھانچے تک کے پرخچے اڑا دیئے۔ اب اس کے کچھ آثار و اثرات جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ جو اچھے ہوں یا برے، ہمارے کلچر کا جز بن چکے ہیں، مغل نہیں رہے۔ ہماری زبانوں پر مغلوں کی درباری زبان فارسی کا اثر مغلوں کے تسلّط سے بہت پہلے غزنویوں کے عہد میں شروع ہو چکا تھا، جو قریب دو سو سال تک پنجاب و سرحد کے حکمراں رہے۔ تو کیا فارسی کے ہزاروں دخیل لفظوں کو پنجابی اور پشتو سے خارج کر دیا جائے؟ اور اگر کلچر کی "تطہیر" کا معیار یہی ٹھیرے کہ اس میں سے تمام "شہنشاہی" اثرات مٹا دیئے جائیں تو سندھی زبان میں سے بھی عربی کے ہزاروں لفظوں کو خارج کر دینا چاہیئے، کہ یہ نہ صرف عربوں کے تسلّط کی، بلکہ بنو امیہ کی شہنشاہیت اور حجّاج کی حکمرانی کی نشانیاں ہیں۔

مغلیہ عہد کے برسرِ اقتدار طبقوں کے رہن سہن کے طریقے، ان کے آداب و اطوار،

ان کی پوشاک، ان کی زبان، ان میں سے اب کون سی چیز ہمارے ملک میں رہ گئی ہے۔؟
موجودہ دور کی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں اور زندگی کے نئے تقاضوں نے انہیں ختم کر دیا ہے یا ان کی صرف نشانیاں چھوڑی ہیں۔ جاگیرداروں اور دوسرے اہلِ ثروت طبقوں کی مخصوص علامتیں، مثلاً اپنے زیرِ اثر عوام کا استحصال، اسراف اور نمود و نمائش، وغیرہ کسی کلچر، سرزمین یا زبان سے مخصوص نہیں۔ یہ طبقاتی اقتدار سے وابستہ ہیں، اور موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں ہی انہیں مٹا سکتی ہیں۔

مغل بادشاہوں اور راجپوت شہزادیوں کے ازدواج پر کٹر مذہبی نقطۂ نظر سے تو اعتراض ہو سکتا ہے اور ہوتا آیا ہے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قومی کلچر پر بحث میں اس استہزا کا کیا محل ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کی تیرہ سو سال کی تواریخ اسلام کے بنیادی اصولوں اور نصوصِ قرآنی کی خلاف ورزیوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس سرخ و سیہ اعمال نامے کو سامنے رکھیے تو اکبر اپنی تمام خامیوں اور اپنی راجپوت بیویوں کے باوجود ہماری تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں کی صف میں نظر آتا ہے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اکبر اعظم کے دور سے آٹھ سو برس پہلے جب عرب فاتح سندھ میں آئے تھے تو انہوں نے یہاں کے ہندوؤں اور بدھوں کو بہت سے امور میں اہلِ کتاب کے حقوق اور رعایتیں عطا کیں۔ اس کے بعد صدیوں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اکثر مسلمان بادشاہوں نے اسی اصول پر عمل کیا۔ سولہویں صدی میں اکبر نے یہی اصول شادی بیاہ کے معاملے میں برتنا شروع کیا تو کیا گناہ کیا۔؟

آج سے کوئی ستّر اسّی سال پہلے شبلی جیسا شیدائے اسلام اور علم بردار شریعت مغل بادشاہوں کی ان شادیوں کی تحسین کس خلوص سے کر گیا۔

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمانده جے پور نے نسبت کی خواہش کی
اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و فکر تھا

دلی عہدِ حکومت اور خود شہنشاہِ اکبر
گئے انبیر تک، جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کاندھوں پر جو لاتے تھے
وہ شہنشاہ اکبر اور جہاں گیر ابنِ اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیز یاں عطرِ محبّت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں سے معطّر تھا

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آج کے خود ساختہ مفتی ان شادیوں پر حرام کاری کا حکم لگاتے ہیں۔ ع

"خدا کی شان کہ ملحد بنے ہیں مفتیٔ دیں"

"شہنشاہی کلچر" کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی سنی گئی کہ اردو کا بادشاہوں اور امرا کے دربار سے بڑا تعلق رہا ہے اور اس کی ترقی بہت کچھ انہی کی سرپرستی کی مرہونِ منت ہے۔ اور بعض ستم ظریفوں نے تو اس مفروضے کی بنا پر یہ حکم بھی صادر کر دیا کہ اردو زبان نہ آج کے پاکستانی عوام کی امنگوں کی آئینہ دار ہو سکتی ہے نہ ان کی انقلابی جدوجہد میں ذریعۂ ابلاغ و بیداری کا کام انجام دے سکتی ہے۔ یہ بے سر و پا باتیں اگر ایسے حضرات کے قلم یا زبان سے نکلتیں جو اردو ادب اور برصغیر کے کلچر کی تاریخ سے ناواقف ہیں تو شاید ان کا ذکر بھی غیر ضروری ہوتا، لیکن افسوس کہ صورت دوسری ہے اور ان عجیب و غریب مفروضوں پر تھوڑی بہت گفتگو ناگزیر ہے۔

زبان ایک کٹر جمہوری ادارہ ہے۔ ہر زبان کی ابتدا عوام کی بول چال سے ہوتی ہے اور اسی پر اس کی نشو و نما اور اس کے پھیلاؤ اور ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کسی معاشرے میں جو طبقہ برسرِ اقتدار ہوتا ہے اس کا اثر معاشرے کے دوسرے اداروں اور کلچر کے دوسرے مظاہر کے ساتھ زبان پر بھی کم و بیش پڑتا ہے۔ مادی وسائل پر اسی طبقے کا قبضہ ہوتا ہے اور اربابِ علم و فن کو اپنے تخلیقی کام کے لئے جس فراغت اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہی طبقہ فراہم کر سکتا ہے۔ لہٰذا اہلِ علم و فن اکثر اس

طبقے کے علم دوست افراد کے درباروں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ آج کا قریب قریب ہر معاشرہ کسی نہ کسی دور میں بادشاہت یا اشرافیت آرسٹاک ریسی کے مرحلے سے ضرور گذرا ہے اور بادشاہوں اور روسا کے درباروں میں اکثر علم و فن اور شعر و ادب کی سرپرستی بھی ہوتی ہے۔ اس سرپرستی کی بدولت عہدِ شاہی کی روایتوں اور قدروں کا عکس لازماً اس زمانے کے ادب اور فن پر بھی پڑا، کہیں کم، کہیں زیادہ۔ مگر اس اثر کی بنا پر کسی زبان کے خلاف آج کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ہر زندہ زبان عوامی زبان ہوتی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ارتقا کے مختلف ادوار میں برسرِ اقتدار طبقے کا اس کے ادب پر کتنا اور کیسا اثر پڑا۔ زمانۂ قدیم میں ارسطو، شاہ فلپ کے دربار سے وابستہ تھا اور اسکندر کا اتالیق تھا، لیکن اس وابستگی سے ارسطو کی عظیم الشان تخلیقات کی وقعت کم نہیں ہو جاتی، نہ یونانی زبان کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں علم و فن اور شعر و ادب کی ترقی بنو امیہ کے دور میں شروع ہوئی، جنہوں نے اسلام کے ابتدائی جمہوری نظام کو ختم کر کے شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور یہ ترقی بڑی حد تک دمشق کے دربار کی سرپرستی کی مرہونِ منت ہے۔ پھر بنو عباس کی شہنشاہیت کے دور میں دنیائے اسلام کی تہذیب اپنے شباب کو پہنچی۔ اسی طرح ہسپانیہ میں مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں علم و فن اور شعر و ادب نے نئے نئے جلوے دکھائے جن سے آج تک انسانی تہذیب کی تاریخ روشن ہے۔

جریر، عراق کے سفاک مگر علم دوست اور علم پرور حکمراں حجّاج کا درباری شاعر تھا۔ ابو نواس، خلیفہ ہارون الرشید کا درباری شاعر اور ندیم تھا۔ اس کا ہم عصر اور حریف ابو العتاہیہ، ہارون کے خزانے سے پچاس ہزار درہم سالانہ وظیفہ پاتا تھا۔ متنبّی نو برس تک حلب میں سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ رہا اور اس کی شان میں قصیدے بھی لکھے، فارابی نے بھی اپنی عمر کا آخری حصّہ اُسی دربار کی سرپرستی میں بسر کیا۔ ابنِ سینا متعدد شاہی درباروں سے وابستہ رہا۔ شاہ نامے کی تخلیق کے ساتھ طوس کے صوبے دار اور غزنی کے بادشاہ کے نام وابستہ ہیں اور اس کے خالق نے سلطان محمود کو خوش کرنے کے لئے ایاز کے خط و خال کی مدح میں بھی شعر کہے۔ امیر خسرو یکے بعد دیگرے متعدد سلاطین دہلی کے درباروں سے وابستہ

رہے۔ شیکسپیئر نے ملکہ الزبتھ کی فرمائش پر ایک پوری تمثیل تخلیق کی۔ ڈاکٹر جانسن، جنھوں نے اپنے مشہور لغت میں دربار سے پنشن پانے والے ادیب کو قوم کا غدار قرار دیا تھا۔ بالآخر خود اس لعنت سے نہ بچ سکے۔

انگلستان میں جمہوریت کا زور شور صدیوں پہلے شروع ہوا اور ورڈزورتھ کے عہد سے تقریباً ایک صدی قبل متوسط طبقہ براہِ راست سیاسی اقتدار میں حصے دار بن چکا تھا، لیکن درباری شاعر کا عہدہ قبول کرنے کے باوجود اس کا شمار آج تک انگریزی کے عظیم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ یہی صورت اس کے بعد کے شاعروں ٹینی سن اور رابرٹ بریجز کی ہے۔

اردو زبان کی ابتدا کہیں اور کسی زمانے میں ہوئی ہو، یہ ظاہر ہے کہ اور تمام زبانوں کی طرح وہ بھی عوامی بول چال سے شروع ہوئی۔ پھر اس کے ارتقا کے ابتدائی مراحل میں صوفیا کرام نے، جن کی اپنی زبان فارسی تھی، اردو کو عوام سے رابطے کے لئے استعمال کیا اور اسی ذریعے سے انسانیت، عالم گیر محبت، اسلامی مساوات اور رواداری کا پیغام ہندوستان میں عام کیا۔ دکن کے بعض مسلمان درباروں کو چھوڑ کر، تیرھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی کے اوائل تک اردو کو ہندوستان کے شاہی درباروں میں کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہ تھی۔ دربار کی اور اس سے وابستہ اہلِ علم و ادب کی زبان فارسی تھی اور وہی سرکاری کاروبار میں ذریعۂ اظہار تھی۔ فارسی کی سرکاری حیثیت تو انگریزوں نے آکر ختم کی۔ اردو شاعری نے شاہی دربار میں جب بار پایا وہ مغل شہنشاہی کے زوال اور اس کی بربادی کا زمانہ تھا۔ یہی زمانہ اردو شاعری کے عروج کا تھا اور اس میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب شاہی سرپرستی سے فیض یاب ہوئے۔ لیکن بعض اس زمانے میں بھی ایسے تھے جو ظلِ شاہی سے دور رہے۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی اور مظہر جانِ جاناں۔ نظیر کے کلام کے پائے کی عوامی شاعری کی مثالیں ہمارے برصغیر کی زبانوں میں کتنی ہیں۔ بے عین عہدِ غلامی میں اسی زبان میں حالی نے مناجاتِ بیوہ لکھی، جو نفسِ مضمون، خیالات و جذبات، طرزِ ادا اور زبان، ہر لحاظ سے عوامی ادب کے عظیم ترین شاہکاروں میں ہے۔ موجودہ عہد میں اسی زبان کے ذریعے اقبال نے اپنی

شاعری سے، ابوالکلام آزاد نے اپنی خطابت اور صحافت سے اور علماء اور سیاست دانوں کی ایک پوری کھیپ نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے قوم کو جھنجوڑا اور اسے آمادۂ پیکار و جہاد کیا۔ پھر گذشتہ چالیس برس میں اردو کے شاعروں، افسانہ نویسوں اور نقادوں نے دنیا کے ترقی پسند ادب میں گراں قدر اضافے کئے۔ مختصر یہ کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کی طرح اردو بھی انواع و اقسام کے خیالات و تصوّرات، آرزوؤں اور امنگوں اور اغراض و مقاصد کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ اس میں خواص کا ادب بھی ہے اور عوام کا بھی، صوفیہ کرام کی روح پرور تعلیمات بھی ہیں اور لذت پرستی اور چوما چاٹی کی شاعری بھی، بادشاہوں اور رئیسوں کے قصیدے بھی ہیں اور باغیانہ اور انقلابی آتش نواتی بھی، محض لفظی شعبدہ بازیاں بھی اور پُر معنی اور پُر بلیغ اور فلسفیانہ تصنیفیں بھی۔ جو لوگ اس بکھرے ہوئے ادبی ذخیرے میں سے صرف درباری شاعری اور پستی اور زوال کے دوسرے آئینے انتخاب کر کے پوری زبان اور اس سے متعلق کلچر کے خلاف حکم لگاتے ہیں وہ زبان یا ادب کا کچھ نہیں بگاڑتے، صرف اپنی بدمذاقی، پست ہمتی اور تعصب کا مظاہرہ کر کے اپنے آپ کو رسوا کرتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ تنگ نظری کا اظہار وہ لوگ کرتے ہیں جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ اردو اپنے شہنشاہی یا جاگیرداری پسِ منظر کے باعث عوامی جذبات اور انقلابی تصوّرات کے لئے موثر ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتی۔ اردو کے عوامی، انقلاب اور ترقی پسند ادب کے بیش بہا خزانے کی طرف اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے، لیکن اگر اردو ادب کا دامن ان تخلیقات سے خالی ہوتا تو بھی یہ اعتراض غلط اور بے معنی ہوتا۔ جو زبان مہذب انسان بولتے ہیں اس کے ذریعے تمام انسانی افکار و تصوّرات، خواہشوں اور امیدوں، اندیشوں اور خدشوں کا اظہار ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے مصلح یا انقلابی افراد اپنے مقاصد کی اشاعت اور حصول کے لئے کوئی نئی زبان وضع نہیں کرتے، بلکہ وہی زبان اختیار کرتے ہیں جو اس زبان کے بولنے والے جابروں، ظالموں اور رجعت پسند افراد و عناصر کی ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے کفارِ عرب کی جو زبان تھی اسی کے وسیلے سے اسلام نے ان کے معاشرتی اور معاشی نظام کے خلاف جہاد کیا اور انہیں ایک نئی زندگی کا پیام دیا۔ دِرد رد

(DIDERO) اور اس کے انسائیکلو پیڈسسٹ رفیقوں نے اپنے دور کی جہالت، توہم پرستی اور ادباری قوتوں کے خلاف جدوجہد اسی زبان میں کی جو شاہی دربار، کلیسا اور برسرِ اقتدار طبقے کی زبان تھی۔ فرانس کے انقلابیوں کی زبان اور (BASTILE) کے زنداں کی دیواریں گرانے والوں کی زبان وہی تھی جو شاہ لوئی شانزدہم اور اس خوف ناک عقوبت گاہ کے محافظوں کی تھی۔ کارل مارکس نے اپنا انقلابی نظریہ اسی جرمن میں پیش اور نشر کیا جو پرشا کے دربار، اس کے امراء اور جرمن پولیس کے جاسوسوں کا ذریعۂ اظہار تھی، فرائڈ اور آئن شٹائن کی وہی زبان تھی جو ہٹلر اور اس کے درندہ صفت حاشیہ برداروں کی۔ لینن اور ٹراٹسکی اور اسٹالن نے اپنی انقلابی جدوجہد کے لئے زار شہنشاہوں اور راس پوٹین ہی کی زبان استعمال کی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی بہت کچھ اسی زبان کے ذریعے لڑی گئی جو اس کے غیر ملکی حکمرانوں کی زبان تھی۔

کلچر یا تہذیب پر بحث میں قومی اور علاقائی ہیروؤں کا ذکر لازماً آتا ہے، اور ہمارے ہاں بھی پچھلے دنوں اس موضوع پر خاصی لے دے ہوئی اور دونوں طرف سے تنگ نظری، تعصّب اور حقیقتوں کے ساتھ زیادتی کی عجیب وغریب مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے غور طلب بات یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں تاریخی تحقیقات اور علم نفسیات کے انکشافات نے بڑے بڑے ہیروؤں کے ملمع اتار دیئے ہیں اور بہت سے بُت بے نقاب کر دیئے ہیں۔ ہیرو کا روایتی تصوّر جو بہت کچھ پرانے طرز کے ناول کے ہیرو کے مثل تھا، دھندلا چکا ہے، اور یہ حقیقت کہ خالص نیکی اور بڑائی یا خالص بدی اور پستی، کا وجود فرضی ہے، بڑی حد تک اپنے آپ کو منوا چکی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان تاریخی شخصیتوں کی، جن کی ہم اب تک ہیروؤں کی حیثیت سے پرستش کرتے آئے ہیں، کمزوریاں یا نقائص بے نقاب کرے تو اس پر برانگیختہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ بے نقاب کرنے والے کی نیت بخیر ہو اور اپنے عملِ جراحی میں وہ حقیقتوں کا خون نہ کرے۔ مثلاً دلی کے بادشاہوں کی مے نوشی اور عیش کوشی، علاءالدین خلجی کے ہاتھوں پر اپنے سب سے بڑے محسن اور بادشاہِ وقت کے خون کے دھبّے، محمد تغلق کے ظالمانہ طریقے، جہانگیر کا خسرو کے

طرفداروں کو میخیں ٹھکوا کر ہلاک کروانا، اورنگ زیب کے حکم سے دارا شکوہ کا قتل اور سلیمان شکوہ کی ہلاکت، ہماری تاریخ کے ناقابلِ تردید واقعات ہیں۔ ان سے ہم کہاں تک چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ یہ اور اگر کوئی شخص اپنی تحریر یا تقریر میں، یا ٹی وی یا ریڈیو پر، ہمیں یہ واقعات یاد دلاتا ہے تو ہم اس کا منہ نوچنے پر کیوں تل جاتے ہیں؟ یا اگر کوئی شخص اپنے مخصوص علاقے کے ہیرو کے گن گاتا ہے تو اس میں غم و غصے کی کیا بات ہے اور اس سے قومی اتحاد کی تنقیص کس طرح ہوتی ہے۔ یہ خوش حال خان خٹک کے نام پر غیر پختون حضرات کیوں ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ یہ اقبال تو پٹھان نہیں تھے، اور عالمگیر کے بڑے مداحوں میں تھے۔ لیکن وہ خوش حال خان کی حریت پسندی، اس کی شجاعت اور مردانگی اور اس کے عزم اور پامردی سے اتنے متاثر تھے کہ نہ صرف اس کی وصیت کو، جس میں مغل شہسواروں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہے، اردو میں نظم کیا، بلکہ انگریزی میں اس کی ثنا و صفت میں ایک مضمون بھی لکھا۔ اس میں خان کے اُن اشعار کا ترجمہ بھی شامل ہے جن میں اورنگ زیب کی کینہ پروری اور اس کے ہاتھوں باپ کی نظر بندی اور بھائیوں کی ہلاکت کی پرزور مذمت کی گئی ہے۔

پرانے قومی اور ملی ہیروؤں کی پرستش اور ان کی طرفداری میں جس حقیقت شکنی، مبالغے، تعصب اور غلو سے کام لیا جاتا ہے وہی نئے علاقائی ہیروؤں کی تلاش اور انہیں منوانے کی کوششوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً خوش حال خان کی مسلّمہ خوبیوں اور عظمت کے اعتراف اور ان کی تحسین کا یہ تقاضا کیوں کر ہو گیا کہ اسے مغلیہ سلطنت کے "مظلوم" پختونوں کی قومی جہدِ آزادی کا امام بھی تسلیم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوش حال خان کا خاندان کئی پشتوں سے شاہانِ مغلیہ کا وفادار تھا اور اس کی اور عالمگیر کی مخاصمت کی ابتدا چنگی وصول کرنے کے حق سے ہوئی جس پر خٹک اور یوسف زئی قبیلوں میں پرانی رقابت تھی۔ مغل صوبے دار کے جابرانہ اور ننگ آمیز سلوک اور، پھر خان کی طویل نظر بندی، نے اس کی اور مغلوں کی مخاصمت کو دشمنی کی حد تک پہنچا یا۔ خان نے بغاوت کا جھنڈا اونچا کیا اور پھر ساری عمر مغلوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔ لیکن پختون قوم کبھی اس کے جھنڈے کے تلے مجتمع نہ ہوئی اور خود اس کے بیٹوں تک نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

قومی اور علاقائی ہیروؤں سے عقیدت فطری بھی ہے اور مناسب حد تک جائز بھی۔

لیکن یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ٹامس کارلائل کا فلسفۂ تاریخ، جو قوموں کی ترقی کو قریباً تمام تر ہیروؤں کی کارگزاری تصوّر کرتا ہے، اب بڑی حد تک فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قوموں کی زندگی میں ترقی اور تبدیلی کے بنیادی محرکات معاشرتی اور اقتصادی حالات پیدا کرتے ہیں اور انہیں بروئے کار لانے میں اکثر اجتماعی عوامل کی کارفرمائی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ معاشرتی اور معاشی عوامل کے عمل اور ردِ عمل کی روشنی میں کیا جائے تو ہیروؤں کی اہمیت بہت کچھ گھٹ جاتی ہے۔ نہ ان سے عقیدت میں شدّت اور غلو کی گنجائش رہتی ہے۔ نہ ان کے مخالفوں کی تنقیص کا غیر معمولی جوش باقی رہتا ہے۔ ہیرو کے تصوّر میں اگر سرزمین سے محبّت اور قومی عصبیّت کی نسبت قدروں کو زیادہ دخل ہو تو بہت سی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور اپنی قوم یا فرقے کے ہیروؤں کے ساتھ ساتھ مخالف گروہوں کے ہیروؤں کا احترام بھی پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو ذرا دیر کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی ہیرو کون ہے۔ ہمارا ہم وطن یا اس کا حریف۔ ؎ اکبر اعظم اور چاند بی بی میں سے خطۂ دکن کے آج کے باسی کس کو اپنا ہیرو مانیں؟ جو لوگ اورنگ زیب کو ہیرو مانتے ہیں وہ خوش حال خان کی شجاعت خودداری اور پامردی کے روح پرور واقعات سے کیسے اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں؟ یا وہ عبدالرزّاق کی وفاداری اور جاں نثاری سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جس نے اپنے آقا، فرمانروائے گولکنڈہ کے قلعے کے دفاع میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ ؎ اس تاریخی واقعے کی تفصیلات بے تعصبی سے پڑھیئے تو خواہ آپ کو عالمگیر سے کتنی ہی عقیدت ہو، کچھ دیر کے لئے تو ضرور عبدالرزاق ہی آپ کو ہیرو نظر آئے گا۔ داراشکوہ کے طرفدار راجپوت سردار جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے اور جس فیاضی سے انہوں نے اپنا خون بہایا وہ بھی تو ہماری تاریخ کا ایک تابناک باب ہے۔ آج کی ہندو بیوہ کس کو اپنا ہیرو مانے؟ اپنے ان شقی القلب آبا و اجداد کو، جو بیواؤں کو زندہ جلوا دیا کرتے تھے، یا غیر مذہب کے اکبر اعظم کو، غیر مذہب اور غیر قوم کے حکمران لارڈ ولیم بنٹنک کو، اور غیر مذہب کے مولانا حالی کو؟ ؎ گزرے ہوئے زمانے کو چھوڑ کر دورِ حاضر کی طرف آئیے اور غور کیجئے کہ قدروں اور نظریات کی جو عالمگیر جنگ پچھلی نصف صدی سے جاری ہے اس کے پیشِ نظر ہیرو کے

تصوّر کو قیدِ مقامی کا پابند کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ؟ کیا آج کے اشتراکی جرمن نوجوانوں کے ہیرو فریڈرک اعظم، قیصر ولیم دوئم اور بسمارک وغیرھم ہیں، جو ان کے ہم قوم اور ہم زبان تھے؟ یا لینن اور اسٹالن ہیں۔ جو اس قوم میں سے تھے جس کے ہاتھوں ابھی تیس پینتیس برس پہلے لاکھوں جرمنوں کا خون ہوا ؟ اور کیا آج کے روسی نوجوانوں کے سب سے بڑے اور محترم ہیرو مارکس اور اینگلز نہیں جن کے ہم قوموں کی درندگی اور خون آشامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے لاکھوں روسی ابھی تک زندہ ہیں۔ ؟

زبان کی طرح کلچر کے خالص یا "پاک" ہونے کا تصوّر بھی بے بنیاد اور رجعت پسندانہ ہے اور کسی ملک یا قوم کی تہذیب کو سرزمین یا عقیدوں کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش مضر بھی ہے اور لاحاصل بھی۔ دنیا کے ہر کلچر میں مقامی زبانوں، رسم و رواج، مذہبی اعتقادات اور اس سرزمین سے وابستہ دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ غیر ملکی اور بین الاقوامی عناصر اور اثرات کم و بیش شامل ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے ہر ملک کے دروازے غیر ملکی اثرات کے لئے کھول دیئے ہیں اور کوئی کلچر ایسا نہیں جس پر غیر ملکی تہذیبوں کا اثر تیزی سے نہ بڑھ رہا ہو۔ انسانی میل جول، اخوّت، اور بین الاقوامی اشتراک و تعاون سے زندگی کو زیادہ پر معنی وسیع اور حسین بنانے کے امکانات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اپنے کلچر کا دائرہ وسیع کرنے کی فکر کریں اور دوسری قوموں کو اپنی تہذیب کے تابناک پہلوؤں سے روشناس کرانے کی کوشش کریں، مگر ہم نے الٹی گنگا بہانی شروع کر دی ہے۔ کلچر کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر صحت مند، صالح اور ترقی پسندانہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب بنی نوع انسان کی بنیادی وحدت اور بین الاقوامی اخوّت پر ہمارا ایمان پختہ ہو اور ہم بھی انگریزی شاعر جان ڈن کی طرح دل سے یہ محسوس کرنے لگیں کہ کسی انسان کی موت سے خود ہمارے وجود کا ایک حصّہ فنا ہو جاتا ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب کی مطبوعات

(۱) دُود چراغ محفل - پیر حسام الدین راشدی — اٹھارہ روپے

غالب کے معترضین، ملاقاتیوں، ہمنواؤں اور شاگردوں کا تذکرہ

(۲) پنج آہنگ - مترجم محمد عمر مہاجر - اٹھارہ روپے

غالب کے ایک سو ساٹھ فارسی خطوط کا ترجمہ

(۳) بزمِ غالب - عبد الروف عروج — پچیس روپے

غالب کے دو سو سے زائد شاگردوں، رشتہ داروں، حریفوں اور دوستوں کا تذکرہ۔

(۴) غالب کا منسوخ دیوان - مسلم ضیائی — اٹھارہ روپے۔

غالب کے متداول دیوان کا کلام اور مسترد کردہ کلام ایک جگہ کر دیا گیا ہے

(۵) غالب نما - ابن حسن قیصر — سات روپے۔

غالب پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کی مدت میں جو کچھ شائع ہوا اس کا اشاریہ

(۶) غالب، سب اچھا کہیں جسے - پروفیسر کرار حسین — پانچ روپے

غالب اور عہدِ غالب پر تنقیدی مقالہ۔

(۷) تا (۱۱) پروفیسر کرار حسین کی کتاب کے پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگلہ تراجم، پانچ پانچ روپے

(۱۲) تماشائے اہلِ کرم — مرزا ظفر الحسن — پانچ روپے۔

ادارۂ یادگارِ غالب کی تقریب "تماشائے اہلِ کرم" کی روداد، اخباری کالم وغیرہ۔

(۱۳) ذکرِ غالب، ذکرِ عبدالحق — سحر انصاری — پانچ روپے

مولوی عبدالحق پر شائع کردہ تین سو مضامین کا اشاریہ اور غالب پر بابائے اُردو کے دو مضامین۔

(۱۴) جریدۂ غالب لائبریری - مرتبین: مرزا ظفر الحسن، سحر انصاری، محسن بھوپالی - پانچ روپے

غالب پر مضامین - ادارے کی تقریبات کی رُوداد، لائبریری کی سرگرمیوں کا حال، مضامین، معلومات، منظومات، تصاویر، خطوط، رائیں وغیرہ۔

ادارۂ یادگارِ غالب کا اشاعتی منصوبہ

اشتراک ۔ محبانِ فیضؔ

(۱) نذرِ فیضؔ	مقالوں کا مجموعہ	اکابرینِ ادب
(۲) عمر گزشتہ کی کتاب	خود نوشت	فیضؔ احمد فیضؔ
(۳) ذکرِ فیضؔ	سوانح عمری	مرتب : مرزا ظفر الحسن
(۴) خونِ سرِ پا	چھٹا اور تازہ شعری مجموعہ	فیضؔ احمد فیضؔ
(۵) اشاریۂ فیضؔ	نظم اور نثر کا مکمل اشاریہ	مرتب : معین الدین عقیل
(۶) اداریے	ادبِ لطیف اور لیل و نہار	فیضؔ احمد فیضؔ
	کے اداریوں کا مجموعہ	

چند کتابیں ترتیب اور چند طباعت کی منزل
میں ہیں۔ تفصیلات کے لیے اس پتے پر مراسلت کیجیے۔

غالب لائبریری

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۸ ناظم آباد کراچی ۱۸ ۔